مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰؍روپے ۔ فی شمارہ ۱۲؍روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰؍روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۔ ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷/اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 — Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، چک بھیجنے کی صورت میں پچاس روپے مزید ارسال کریں، چک یا بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

☆ DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہنچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا، رقم پیشگی آنی چاہیے۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۷۷ ماہ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ جون ۲۰۰۶ء عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

وفیات

ای میل: email: shibli_academy@rediffmail.com

شذرات

ملک کی چار ریاستوں اور مرکزی علاقے پانڈیچری کی اسمبلیوں کے انتخابی نتائج سے سیکولر جماعتوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے، ان ریاستوں میں یوپی اے اور این ڈی اے یا سیکولر اور فرقہ پرست جماعتوں میں براہ راست مقابلہ نہیں تھا بلکہ سیکولر جماعتوں اور ترقی پسند اتحاد کی حلیف جماعتوں کی باہمی لڑائی تھی، یہاں شمالی ہندوستان کی طرح فرقہ پرستوں کا زیادہ زور و اثر نہیں تھا بلکہ وہ دوسروں کے سہارے یہاں اپنی جڑیں جمانا چاہتے ہیں، اس سے پہلے کے انتخابات میں مغربی بنگال میں ترنمول کانگریس کی بہ دولت ان کو کچھ کامیابی مل گئی تھی مگر اس دفعہ ووٹروں نے فرقہ پرستوں کی طرح ان کی حلیف جماعتوں کو بھی مسترد کردیا اور وہ کھوٹے سے دھوکا نہ کھاسکے لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ آئندہ سال کے ریاستی انتخابات کا بھی یہی حال ہوگا، کیوں کہ ان کے اور ان ریاستوں بالخصوص اتر پردیش کے جن میں اب انتخابات ہوں گے حالات بہت کچھ مختلف ہیں، اگر ان میں سیکولر جماعتوں کی باہمی لڑائی اسی طرح رہی تو بی جے پی اور اس کے اتحادی فائدے اٹھالیں گے۔

بہار کی مثال موجود ہے جہاں کرشمہ ساز لیڈر لالو پرشاد یادو اور رام ولاس پاسوان کے شدید اختلاف اور اس پر مستزاد کانگریس اور دوسری چھوٹی جماعتوں کی راہیں الگ الگ ہونے سے این ڈی اے کی حکومت بن گئی جس میں بی جے پی بھی شریک ہے اور وہی اس کی دوسری بڑی جماعت ہے، یہی صورت دوسری ریاستوں بالخصوص اتر پردیش کی بھی ہوسکتی ہے جہاں بی جے پی اگرچہ تیسرے نمبر پر ہے مگر اول و دوم نمبر کی پارٹیوں میں ایسی شدید کشمکش ہے کہ وہ مل نہیں سکتیں البتہ بی جے پی سے پینگیں بڑھا سکتی ہیں اور ایک تو ان کے ہتھے چڑھتی بھی رہی ہے، ان کے علاوہ یہاں کانگریس اور دیگر تو تھیں ہی اب جن مورچہ بھی ہاتھ پیر مار رہا ہے اور بعض مسلم رہنما بھی آسام یونائیٹیڈ ڈیموکریٹک فرنٹ سے حوصلہ پاکر مشترکہ پلیٹ فارم بنانے کی تیاری میں ہیں، اس پر تو بحث ہوسکتی ہے کہ آسام کا تجربہ اتر پردیش اور شمالی ہند میں کامیاب ہوگا یا نہیں مگر اس پر میڈیا اور بعض سیاسی پارٹیوں کی برہمی ناقابل فہم ہے، کیا آزاد اور جمہوری ہندوستان میں کسی فرقے کو اپنی پسند کی

پارٹی بنانے کا حق نہیں ہے لیکن یہ جملہ معترضہ تھا ہم کو کہنا یہ تھا کہ یہ سیکولر پارٹیاں بی جے پی کے ووٹ بینک میں تو سیندھ نہیں لگائیں گی البتہ سیکولر ووٹوں کو تقسیم کرکے اس کے آنے کا راستہ ہموار کریں گی، ان کے باہمی سمجھوتے کی توقع فضول ہے، اس لیے اب ساری امیدیں سیکولر ووٹروں سے ہیں، ان ہی کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی فرقہ پرستی کی یلغار کو روک سکتی ہے۔

کانگریس کی قیادت میں یوپی اے حکومت دو سال پورا کرنے پر فخر و مسرت ظاہر کررہی ہے مگر دوسری پارٹیاں مہنگائی اور گرانی بہت بڑھ جانے کے لیے اس کی شدید مذمت کررہی ہیں جو بے جا نہیں، حکومت کا رویہ مسلمانوں کے معاملے میں سردمہری کا ہے، رائے بریلی سے لوک سبھا کے ضمنی انتخاب میں کامیاب ہونے کے بعد کانگریس کی صدر اور ترقی پسند اتحاد کی چیئر پرسن مسز سونیا گاندھی پہلی بار پارلیمنٹ میں پہنچیں تو بڑودہ کے فساد کے لیے ریاستی انتظامیہ کو پوری طرح ذمہ دار قرار دیتے ہوئے کہا کہ تشدد ریاستی حکومت کی جانب داری اور بے حسی کی وجہ سے ہوا، اس فساد میں تین سو سال پرانی مسلمانوں کی درگاہ ڈھادی گئی اور ان کی کئی قیمتی جانیں بھی چلی گئیں، اس سے پہلے یہیں سے وہ بھیانک فساد بھی شروع ہوا تھا جس میں ہزاروں سے زیادہ مسلمان مارے گئے اور بے حساب نقصان ہوا اور ساری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہوئی جس کو اس وقت کے وزیر اعظم نے فلسفہ ردعمل کہہ کر ہنسی میں اڑادیا تھا مگر اب تو یہ حقیقت آشکارا ہوچکی ہے کہ وہ بھی ریاستی حکومت ہی کی منظم اور منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھا مگر یہ اور اس طرح کے متعدد واقعات میں حکومت کی کہیں چوکسی نہیں دکھائی دیتی، بابری مسجد کے انہدام میں کانگریس بھی بی جے پی سے کم ذمہ دار نہیں، آخر اس کے مقدمے کب تک چلتے رہیں گے، سی پی آئی (ایم) کے جنرل سکریٹری پرکاش کرت نے بنگال اور کیرالا میں اپنی پارٹی کی شان دار کامیابی پر کہا تھا کہ اس سے ہماری ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، اقتدار میں آنے کے بعد ترقی پسند اتحاد کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑھ گئی ہیں، اسے دو سال گزرنے کے بعد دیکھنا چاہیے کہ وہ اس سے عہدہ برآ ہورہی یا نہیں؟

اس وقت سنگھ پریوار کو تبدیلی مذہب مخالف بل لانے پر بڑا اصرار ہے، بی جے پی کے قومی صدر نے کہا کہ اگر تبدیلی مذہب کو نہیں روکا گیا تو بھارت میں ہندو اقلیت میں ہوجائیں گے،

راشٹریہ سیوم سنگھ کے چیف کے ایس سدرشن نے کہا کہ آندھرا پردیش میں غیر ملکی پیسے کی مدد سے عیسائی مشنریاں بڑے پیمانے پر ہندوؤں کے مذہب تبدیل کررہی ہیں، ان کے خیال میں ایسی سرگرمیاں ایک مہذب معاشرے اور سیکولرزم کے اصولوں کے خلاف ہیں، انہوں نے آندھرا پردیش کے وزیر اعلا سے اپیل کی کہ ان سرگرمیوں پر روک لگائی جائے، نہیں تو ہندوؤں کے سامنے ایجی ٹیشن کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہے گا تاکہ معاشرے کے مفاد کو بچایا جاسکے، عیسائی مشنریوں پر قبائلیوں اور غریب عوام کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے کا الزام وشو ہندو پریشد کے لیڈروں نے بھی لگائے ہیں، راجستھان کی بی جے پی حکومت نے اسمبلی میں تبدیلی مذہب کو روکنے کا بل اپوزیشن کانگریس پارٹی کے زبردست احتجاج کے باوجود اس کی غیر موجودگی میں پاس کردیا مگر ریاستی گورنر نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ صدر جمہوریہ کے پاس بھیجا جائے۔

دراصل بی جے پی کی کوئی ادا فریب اور عیاری سے خالی نہیں ہوتی، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ تبدیل مذہب کا واقعی سبب کیا ہے، اس میں زور زبردستی کا کوئی دخل نہیں، بلکہ تبدیلِ مذہب کو روکنے کے لیے قانون بنا کر وہ خود اقلیتوں کو سراسیمہ کرنا اور انسان کی آزادی رائے و خیال کے فطری حق کو سلب کرنا چاہتی ہے اور بعض علاقوں میں جہاں مسلمان پس ماندہ، کم زور اور تھوڑے ہوتے ہیں، سنگھ پریوار کے لوگ انہیں زبردستی ہندو بنالیتے ہیں اور حکومت کی مشنری بھی اس میں ان کی مدد کرتی ہے، ہندوستان کے آئین و دستور میں اس کے ہر شہری کو جس طرح اپنے پسندیدہ مذہب کو اختیار کرنے کا حق اور مذہبی آزادی دی گئی ہے اسی طرح اپنے عقیدہ و مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا حق بھی دیا گیا ہے اور یہ دنیا کے ہر مہذب اور امن پسند معاشرے کا دستور ہے اور جبراً کسی کو اس کے مذہب و عقیدہ سے روکنا یہ غیر مہذب اور وحشیانہ معاشرے کی علامت ہے، اسی لیے تبدیل مذہب بل کی مخالفت انسانی حقوق سے متعلق تنظیمیں بھی کررہی ہیں اور اسلام نے صاف صاف کہا ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی جبر و اکراہ نہیں، لوگوں کی اصلاح و ہدایت اور ایمان کے لیے جب رسول اللہ ﷺ پریشان ہوتے تو کہا جاتا کہ ہدایت و ایمان دینا خدا کا کام ہے، آپ صرف تبلیغ و دعوت پر مامور کیے گئے ہیں، آپ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنا سکتے۔

☆☆☆

مقالات

زلزلوں کا اسلامی فلسفہ اور ابن عباسؓ کی حدیث کی سائنسی اہمیت [۱]

از:- مولانا انیس الرحمن ندوی☆

زلزلوں کا شمار زمین پر واقع ہونے والے فطرت کے طاقت ور ترین مظاہر میں ہوتا ہے، جن کے نتائج تباہ کن اور قیامت خیز ثابت ہوسکتے ہیں، بسا اوقات ان کی تباہ کاریاں ایسی ہول ناک ہوتی ہیں جن سے بڑے بڑے شہر اور پورے پورے علاقے کھنڈروں اور ویرانوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور آباد انسانی علاقے قبرستانوں میں بدل جاتے ہیں، اکثر زلزلے بذات خود انسانوں کی اموات کا ذریعہ نہیں بنتے بلکہ زلزلوں سے اکثر اموات اور تباہی انسان کی بنائی ہوئی عمارتوں، پلوں اور دوسری اشیا کے گرنے کی وجہ سے واقع ہوتی ہیں۔

زلزلوں کی ہول ناکی جدید تحقیقات کے مطابق ایک شدید ترین زلزلے سے خارج ہونے والی توانائی energy ایک آٹم بم atomic bomb سے دس ہزار گنا زیادہ تک ہوسکتی ہے،

[۱] اس مضمون میں اگرچہ ایک بڑا اہم اور نیا نظریہ پیش کیا گیا ہے تاہم اس سے بعض اہل علم کو اختلاف ہوسکتا ہے خصوصاً سورۂ ق وغیرہ سے متعلق مباحث قرآن مجید کے اکثر طالب علموں کے لیے باعث خلجان ہوں گے، اس لیے اگر کوئی صاحب اس پر عالمانہ اور مدلل انداز میں کچھ لکھیں گے تو اسے "معارف" میں شکریے کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔ (معارف)

☆ رفیق، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور ۲۹۔

زلزلے دراصل کرۂ ارض کی بالائی پرت میں واقع چٹانوں کے اچانک ٹوٹ جانے یا حرکت پذیر ہونے کی وجہ سے سطح زمین پر واقع ہونے والی ارتعاش و جنبش کو کہتے ہیں، لہذا کسی زلزلے کی شدت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان چٹانوں میں کس قدر شگاف پڑا یا وہ کس قدر حرکت پذیر ہوئیں، زلزلوں کے دوران چٹانوں کی یہ حرکات اتنی موثر بھی ہوسکتی ہیں کہ اس سے ہماری زمین کا جغرافیہ بھی بدل سکتا ہے، وہ ندیوں کو اپنا راستہ بدلنے پر مجبور کرسکتے ہیں اور ان سے پہاڑوں کی شکل و ہیئت بھی تبدیل ہوسکتی ہے، زلزلوں کے دوران زمین اور پہاڑوں کا کھسکاؤ landslide سے بے تحاشہ جانی و مالی نقصان ہوسکتا ہے، پاکستان میں ان دنوں آیا زلزلہ اس کی ایک مثال ہے جہاں پہاڑیوں کے کھسکاؤ سے ان کے دامن میں واقع آبادیاں اور گاؤں کے گاؤں دفن ہوگئے، سمندروں کے فرش تلے واقع ہونے والے زلزلے سمندر میں سلسلہ وار عظیم موجوں کے پیدا ہونے کا سبب بنتے ہیں جن کو سنامی tsunami کہا جاتا ہے، یہ موجیں براعظموں کے ساحل پر پہنچ کر قیامت خیز تباہی مچاتی ہیں جن سے بسا اوقات سمندری جزیروں کا جغرافیہ تک تبدیل ہوکر رہ جاتا ہے، حالیہ دنوں (دسمبر ۲۰۰۴ء) میں جزائر انڈونیشیا اور بحر ہند میں واقع سنامی زلزلہ اس کی تازہ مثال ہے، جس کی ہولناکی کا نظارہ ساری دنیا نے دم بہ خود ہوکر کیا۔

زلزلوں سے متعلق قدیم نظریات زمانہ قدیم میں زلزلوں کے پیدا ہونے کے اسباب کو لے کر لوگوں میں عموماً مختلف اوہام و خرافات رائج تھے، مثلاً یہ کہ ہماری زمین ایک دیوہیکل سانپ اور بعض کے نزدیک ایک عظیم اژدھے اور بعض کے مطابق ایک بڑے مکڑے پر قائم ہے، لہذا جب یہ اپنے آپ کو حرکت دیتے ہیں تو اس کی وجہ سے زلزلہ رونما ہوتا ہے۔

In Japan, earth tremors were thought to be caused by the subterranean stirrings of a giant catfish, normally restrained with a big mallet by a watchful deity. This belief was paralleled by similar ideas in China and India - except that a big tortoise and a giant mole were the respective culprits in those regions

Around 300 B.C., the Greek philosopher Aristotle theorized that winds from above were drawn into hollow passageways deep inside the earth. Agitated by fire and seeking to escape, these winds caused quakes and sometimes erupted as volcanoes. (1)

> ''جاپان میں زمینی ارتعاشات کو زیر زمین ایک عظیم الجثہ مچھلی کی فعالیت کا نتیجہ سمجھا گیا، جو عموماً ایک نگراں ہستی کے ایک بڑے ہتھوڑے کے ذریعہ باز رکھی جاتی تھی، ہندوستان اور چین میں بھی اس سلسلے میں تقریباً یہی نظریات رائج تھے، البتہ ان علاقوں میں (مچھلی کے بجائے) بڑے مگر مچھ اور عظیم الجثہ چھچھوندر اس جرم کا سبب گردانے گئے، تقریباً ۳۰۰ ق م میں یونانی فلسفی ارسطو نے یہ نظریہ پیش کیا کہ سطح زمین کے اوپر کی ہوائیں مجوف اور کھوکھلے راستوں سے کرۂ ارض کے اندرون تک داخل ہوتی ہیں، یہ ہوائیں آگ کے ذریعہ مشتعل ہوکر بھاگ نکلنے کی کوشش کرتی ہیں جس کی وجہ سے زلزلے اور کبھی آتش فشاں رونما ہوتے ہیں''۔

ایک حدیث شریف میں بھی زلزلوں کے واقع ہونے کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس میں زلزلوں کا فلسفہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ زلزلوں کے پیدا ہونے اور اس کے پیچھے کارفرما فطری عوامل سے بحث کی گئی ہے، زلزلوں کے سلسلے میں حدیث شریف کے اس بیان کو بھی عصر حاضر تک ان ہی اوہام و خرافات کی ایک کڑی مانا جاتا رہا، مگر آج علم طبقات الارض geology کی جدید ترین تحقیقات نے اس حدیث کو لفظ بہ لفظ صحیح ثابت کرکے اس حدیث کی علمی و اعجازی اہمیت کو اجاگر کردیا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی اس مختصر سی حدیث میں زلزلوں کے اسباب و محرکات کے علاوہ علم طبقات الارض کا لب لباب اور خاکہ بھی آگیا ہے، اس حدیث پر تفصیلی بحث اس مضمون میں آگے آئے گی، مگر اس کے مندرجات اور ان کی معنویت اور مصداقیت کو سمجھنے کے لیے پہلے جدید علم طبقات الارض کے نظریات اور اس کی اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے، لہذا

یہاں سب سے پہلے علم طبقات الارض اور زلزلوں کے اسباب و محرکات کے سلسلے میں جدید ترین تحقیقات و اکتشافات کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

علم طبقات الارض کے بنیادی نظریات ماہرین علم طبقات الارض، ہمارے کرۂ ارض کو چار ترکیبی پرتوں structural layers میں بانٹتے ہیں:

۱-قشر ارض crest ۲-غلاف ارض mantle

۳-داخلی مرکز inner core ۴-خارجی مرکز outer core

قشر ارض crest یہ ہمارے کرۂ ارض کی سب سے اوپری پرت ہے، کرۂ ارض کے اندرونی ڈھانچے کو یہ نحیف سی چٹانی پرت چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، اس پرت کے بالائی حصہ پر ہمارے تمام براعظم اور سمندر واقع ہیں، اس پرت کی موٹائی براعظموں کے نیچے تقریباً چالیس کلومیٹر ہے جبکہ سمندروں کے فرش تلے اس کی موٹائی تقریباً ۸ کلومیٹر ہے، لہذا کرۂ ارض اور قشر ارض کا تناسب ایسے ہی ہے جیسے کہ انڈے کے مقابلے انڈے کا قشر، اگر انڈے کو کرۂ ارض تصور کیا جائے تو قشر ارض انڈے کے قشر کے برابر ہوگا۔

جیسے جیسے قشری چٹانیں سطح زمین کی بہ نسبت گہری ہوتی چلی گئی ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کے درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا ہے، لہذا قشر ارض میں سب سے عمیق چٹان کا درجہ حرارت 870° سیلسیس ہے، ماہرین علم طبقات الارض نے قشر ارض میں پائی جانے والی ان چٹانوں کی کئی اقسام بیان کی ہیں۔

قشر ارض کے نیچے دہکتی ہوئی چٹانوں اور دھات کا کرہ ہے، جن کی حقیقت و ماہیت سے جدید علم طبقات الارض اگر چہ نابلد ہے، البتہ زلزلوں کی لہروں کے مختلف رکارڈس کے مطالعہ سے ماہرین ارضیات نے اس کی حقیقت جاننے کی طرف پیش رفت ضرور کی ہے اور اس سلسلے میں بعض قیاسات و نظریات قائم کیے ہیں، لہذا کرۂ ارض کے اس اندرونی گرم گولہ کو ماہرین نے بقیہ تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جو غلاف ارض، خارجی مرکز اور داخلی مرکز ہیں۔

غلاف ارض mantle: یہ قشر ارض کے نیچے واقع ایک موٹی چٹانی پرت ہے، یہ سطح زمین سے تقریباً 2900 کلومیٹر گہری ہے، اس غلاف کے اوپری حصہ میں درجہ حرارت 870°

ڈگری سیلسیس سے اس کی آخری انتہا تک 4400° تک بڑھتا چلا گیا ہے، اس غلاف کا اوپری حصہ ٹھوس چٹانی ہے جبکہ اس کا نچلا حصہ سیال ہے۔

خارجی مرکز outer core: سطح زمین سے 2900 کلومیٹر پر جہاں غلاف ارض ختم ہوتا ہے، وہاں سے ایک تیسری پرت یعنی خارجی مرکز outer core شروع ہوتی ہے جو تقریباً 2250 کلومیٹر موٹی ہے، یہ پرت پگھلے ہوئے لوہے اور نکل nickle کی شکل میں ہے، اس خارجی پرت کا درجہ حرارت اس کی اوپری سطح پر 4500° ڈگری سیلسیس سے شروع ہو کر اس کی اندرونی انتہا تک 6300° سیلسیس تک پہنچ گیا ہے۔
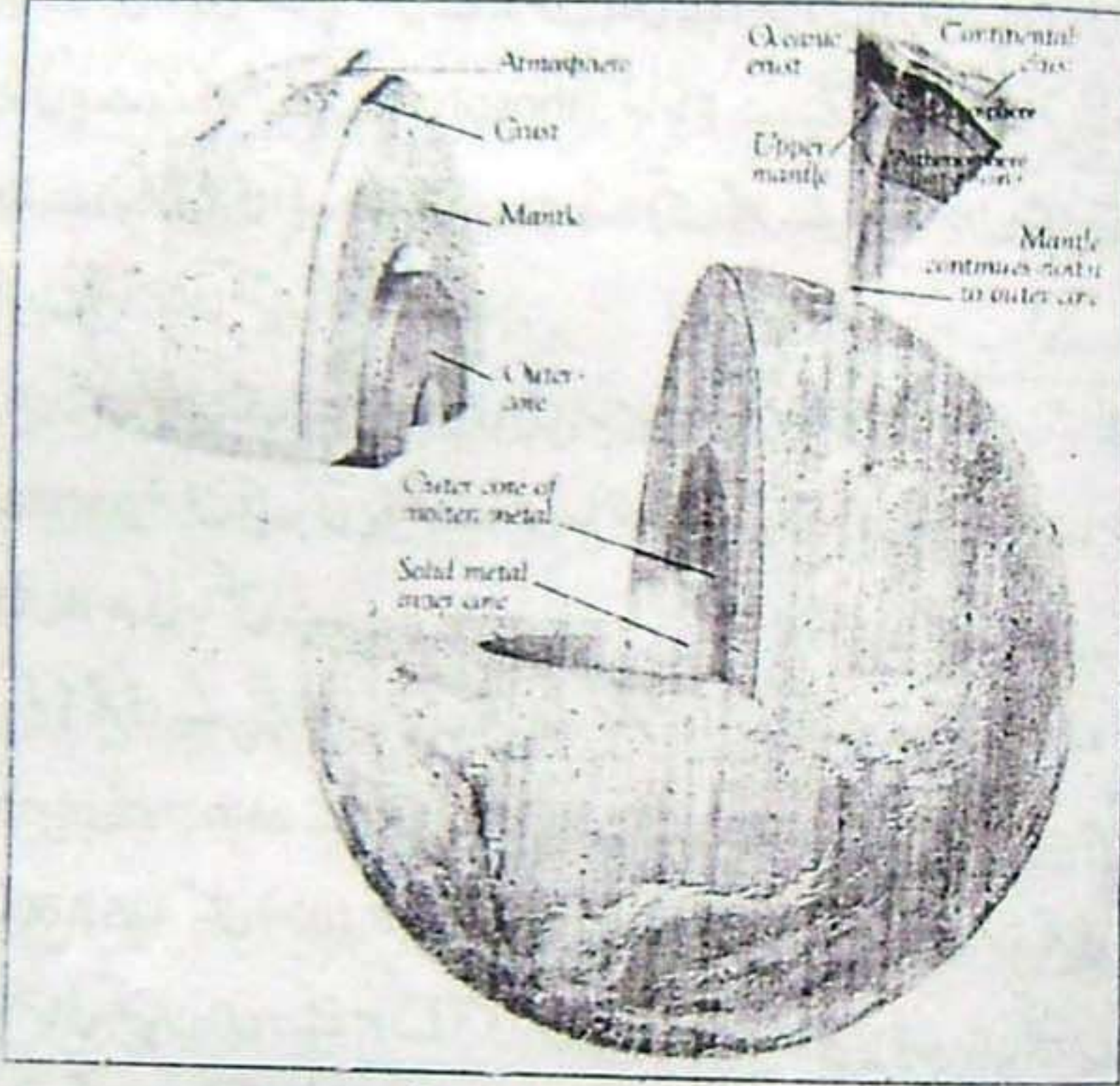
شکل ۱: زمین کا اندرون: زمین کی چار طبقاتی پرتوں کی تقسیم اور ان کی شکل و ہیئت

داخلی مرکز inner core: یہ ایک گولہ کی شکل میں ہے، اس کو خارجی مرکز چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، یہ زمین کے بیچوں بیچ واقع ہے، یہ سطح زمین سے تقریباً 5150 کلومیٹر کی گہرائی سے شروع ہوتا ہے، اس کی موٹائی 1300 کلومیٹر ہے، یہ ٹھوس لوہے اور نکل سے بنا ہوا ہے، یہاں کا شدید ترین درجہ حرارت 7000° تک ہوسکتا ہے ۲، زمین کی ان چار پرتوں کو شکل

نمبر ایک سے سمجھا جاسکتا ہے۔

نظریہ ساختمانی تختیاں plate tectonics ماہرین ارضیات نے زمین کی اہم جغرافیائی خصوصیات کی تشکیل مثلاً پہاڑوں، ندیوں، سمندروں، سمندری کھائیوں، سمندری ریڑھوں اور اسی طرح زلزلوں اور آتش فشاں وغیرہ زمینی آفات کے پیدا ہونے کے اسباب و محرکات کو جاننے کے لیے بیسویں صدی کے نصف آخر میں ایک اہم نظریہ پیش کیا، اس نظریہ کو نظریہ ساختمانی تختیاں theory of plate tectonics کہا جاتا ہے، اس نظریہ کے مطابق ہمارا کرۂ ارض کا ایک خارجی خول outer shell ہے، جو پورے قشر ارض crest کے ساتھ ساتھ غلاف ارض mantle کے اس اوپری حصہ پر مشتمل ہے جو ٹھوس چٹانی ہے، قشر ارض اور غلاف ارض کی اس مشترکہ چٹانی پرت کو کرۂ ارض حجری lithosphere کہا جاتا ہے، یہ کرۂ حجری ہر جگہ تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر موٹا ہے، یہ کرۂ حجری ایک وحدت نہیں ہے بلکہ وہ تیس چھوٹے بڑے ٹکڑوں میں بنٹا ہوا ہے، ان ٹکڑوں کو ساختمانی تختیاں کہا جاتا ہے۔

ان چٹانی تختیوں میں سے بعض تختیاں اپنی جسامت میں دیوہیکل ہیں، مثلاً پورا بحر الکاہل pacific ocean صرف ایک تختی پر قائم ہے، ان ساختمانی تختیوں کی اشکال اور ان کی جسامت شکل نمبر ۲ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

کرۂ حجری کے نیچے غلاف ارض کا نسبتاً کم ٹھوس اور دہکتے ہوئے لاوا کا کرہ کرۂ آتشیں asthenosphere ہے، کرۂ آتشیں غلاف ارض mantle کا وہ حصہ ہے جو سطح زمین سے 60 تا 435 میل (100 تا 700 کلومیٹر) نیچے تک پھیلا ہوا ہے، کرۂ حجری کی دیوہیکل ساختمانی تختیاں اس دہکتے ہوئے آتشی کرہ پر مستقل حرکت پذیر ہیں، ان تختیوں کی حرکت کی رفتار اگرچہ دس سینٹی میٹر سالانہ جیسی دھیمی ہے مگر لاکھوں لاکھ سال سے ان کی اس مستقل حرکت پذیری ہی کی بنا پر آج کرۂ ارض پر واقع عظیم سمندر اور براعظم موجودہ شکل و صورت میں تشکیل پائے ہیں اور ان کی شکل و ہیئت آج بھی تغیر پذیر ہے، کیوں کہ سطح زمین پر واقع براعظم اور دریا وغیرہ ان دیوہیکل تختیوں کے اوپری حصہ سے جڑے ہوئے ہیں اور جیسے جیسے یہ دیوہیکل تختیاں حرکت کررہی ہیں ویسے وہ اپنے ساتھ ان براعظموں اور سمندروں کو بھی

لے کر چل رہی ہیں۔

Courtsey World Book Encyclopaedia 1996
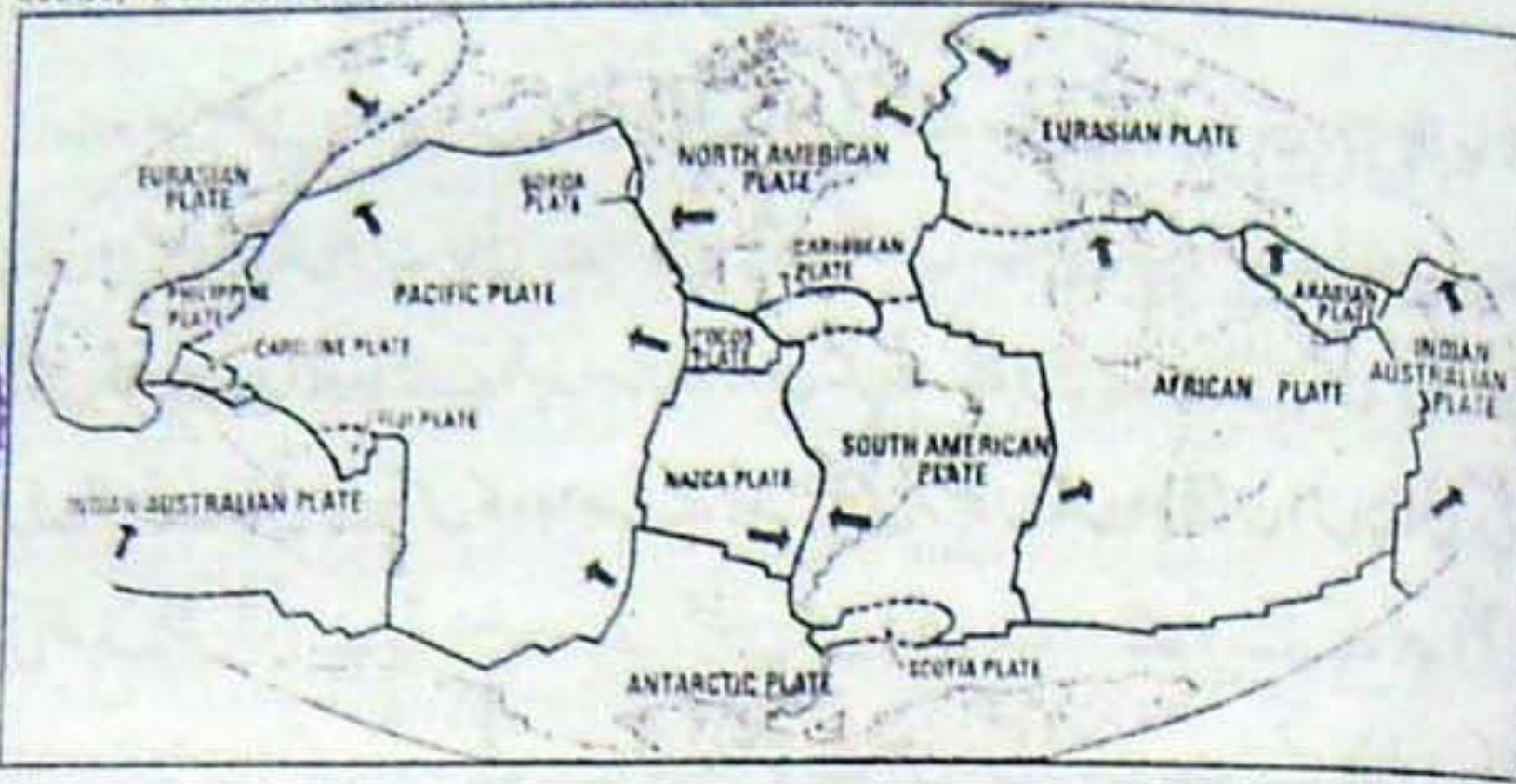
شکل ۲: کرۂ ارض کی ساختمانی تختیاں: کرۂ ارض کا بیرونی خول تیس چھوٹی بڑی ساختمانی تختیوں پر مشتمل ہے۔ ان چٹانی تختیوں میں سے بعض ہمارے عظیم سمندروں، بعض براعظموں اور بعض دونوں کو اٹھائے ہوئے ہیں، جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہورہا ہے۔ اس شکل میں سمتی نشانات ان سمتوں کی نشاندہی کررہے ہیں جن سمتوں کی طرف یہ ساختمانی تختیاں حرکت کررہی ہیں۔

زلزلے کب اور کہاں آتے ہیں؟ یہ ساختمانی تختیاں اپنے دوران حرکت بسا اوقات ایک دوسرے سے ٹکراتی، دور بھاگتی اور کبھی کبھی ایک دوسرے پر چڑھ آتی بھی ہیں، ان تختیوں کے دوران حرکت یہی حادثات سطح زمین پر زلزلوں کے آنے اور آتش فشاں کے پھٹنے وغیرہ کا سبب بنتی ہیں۔

ان ساختمانی تختیوں کی مستقل حرکت کی وجہ سے ان کی سرحدوں اور ان سے قریبی مقامات پر ان چٹانی تختیوں میں تناؤ strain پیدا ہوجاتا ہے اور ان سرحدوں کے اردگرد رخنہ دار منطقہ zones of faults بن گئے ہیں، ان رخنہ دار منطقوں میں کہیں کہیں اس چٹانی تختی کا یہ حصہ مقفل ہوجاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس چٹانی تختی کے ساتھ حرکت نہیں کرسکتی جس کا وہ حصہ ہے، لہذا اس رخنہ دار چٹان پر دونوں سروں سے جب تناؤ بڑھ جاتا ہے تو یہ اس چٹان کے ٹوٹنے کا سبب بنتا ہے، لہذا ان چٹانوں کے ٹوٹنے کی وجہ سے واقع ہونے والے تغیرات اور ارتعاشات سطح زمین پر زلزلیاتی لہروں seismic waves کی شکل میں رونما ہوتے ہیں۔

چٹانی رخنوں کی اقسام سائنس دانوں نے ان چٹانی رخنوں کی تین اقسام بیان کی ہیں، جن کی وجہ سے سطح زمین پر زلزلے رونما ہوتے ہیں:

۱- سادہ رخنے normal faults ۲- معکوس رخنے reverse faults

۳- تصادم-رپٹ رخنے strike-slip faults

سادہ اور معکوس رخنوں میں چٹانی شگاف اوپری حصے سے نیچے تک وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اور چٹان دو حصوں میں ٹوٹ جاتی ہے اور ان چٹانی ٹکڑوں کے اوپر نیچے ہونے کی وجہ سے ان کی سطح میں تفاوت پیدا ہوجاتا ہے، لہذا سادہ رخنوں میں ٹوٹنے والی چٹان اس چٹانی سطح سے نیچے کی طرف لڑھک جاتی ہے جس کا وہ حصہ ہے جبکہ معکوس رخنوں میں وہ چٹان اس چٹانی سطح سے اوپر کی طرف نکل آتی ہے، تصادم-رپٹ رخنوں میں چٹان کے دو حصے ٹوٹنے کے بعد افقی طور پر horizontally ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں، سطح زمین سے نیچے چٹانوں کی یہی حرکات زلزلوں کے آنے کا سبب بنتی ہیں، چٹانی رخنوں کی ان مختلف اقسام کو شکل نمبر ۳ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

(الف) سادہ رخنے (ب) معکوس رخنے

(ج) تصادم-رپٹ رخنے
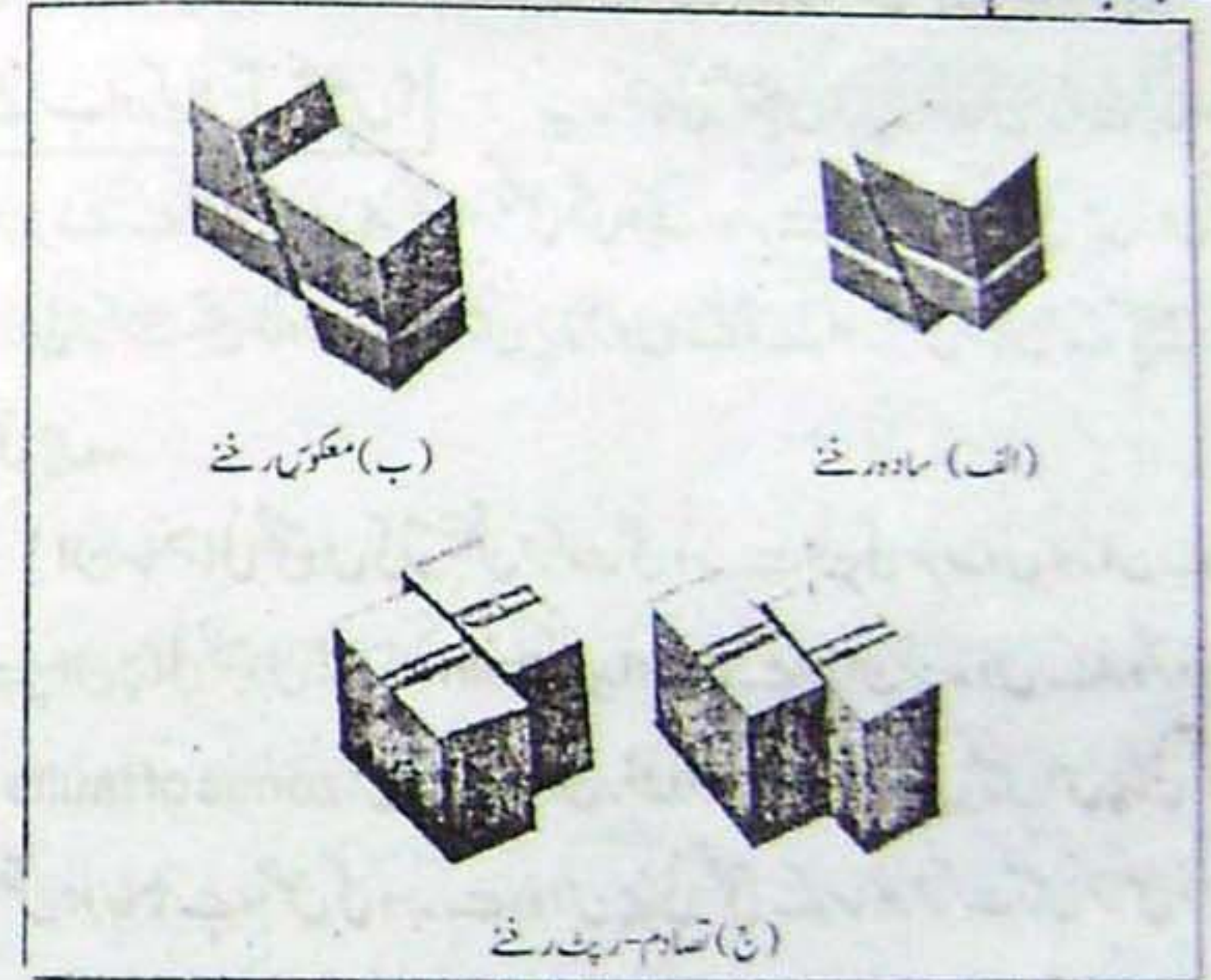
شکل ۳: سطح زمین سے نیچے واقع چٹانی حرکات اور رخنے جن کی وجہ سے زلزلے رونما ہوتے ہیں

زلزلوں کی اقسام ماہرین ارضیات بنیادی طور پر زلزلوں کو دو قسموں میں بانٹتے ہیں:

۱- بین التختی زلزلے interplate earthquakes اور ۲- داخل تختی زلزلے intraplate earthquakes ، بین التختی زلزلے وہ ہوتے ہیں جو ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع رخنہ دار منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، زلزلوں کی اکثریت انہیں منطقوں میں

واقع ہوتی ہے، ان زلزلوں کے واقع ہونے کے اسباب پر اوپر بحث کی جاچکی ہے۔

داخل تختی زلزلے وہ ہوتے ہیں جو ان ساختمانی تختیوں کی سرحدوں کے بجائے ان تختیوں کے بیچوں بیچ واقع ہوتے ہیں، اس قسم کے زلزلے کمیت اور کیفیت دونوں میں بین التختی زلزلوں سے بہت کم اور نحیف ہوتے ہیں، لہذا ایک شدید ترین داخل تختی زلزلہ اپنی شدت میں ایک شدید ترین بین التختی زلزلے سے سوگنا کم ہوتا ہے۔

داخل تختی زلزلے عام طور پر کسی ساختمانی تختی کے نسبتاً کم زور اور نرم منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، سائنس دانوں نے اس قسم کے زلزلوں کے واقع ہونے کے مختلف وجوہ بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان تختیوں کے نیچے درجہ حرارت temperature میں تبدیلی اور تناؤ strain میں شدت کی وجہ سے ان چٹانی تختیوں میں پیدا ہونے والے کھنچاؤ کے سبب واقع ہوتے ہیں، ماہرین ارضیات کے مطابق اس قسم کے زلزلوں کے واقع ہونے کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے واقع ہونے کا تعلق ان ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع ہونے والے تغیرات سے بلا واسطہ طور پر بھی ہو، جہاں پر عظیم پہاڑی سلسلے اور سمندری ریڑھ oceanic ridge واقع ہیں، مندرجہ ذیل شکل ۴ میں کرۂ ارض پر واقع ہونے والے پچھلے تیس سالہ زلزلوں کا رکارڈ پیش کیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر زلزلے ساختمانی تختیوں کے کناروں پر واقع ہوتے ہیں۔

Courtsey World Book Encyclopaedia, 1996
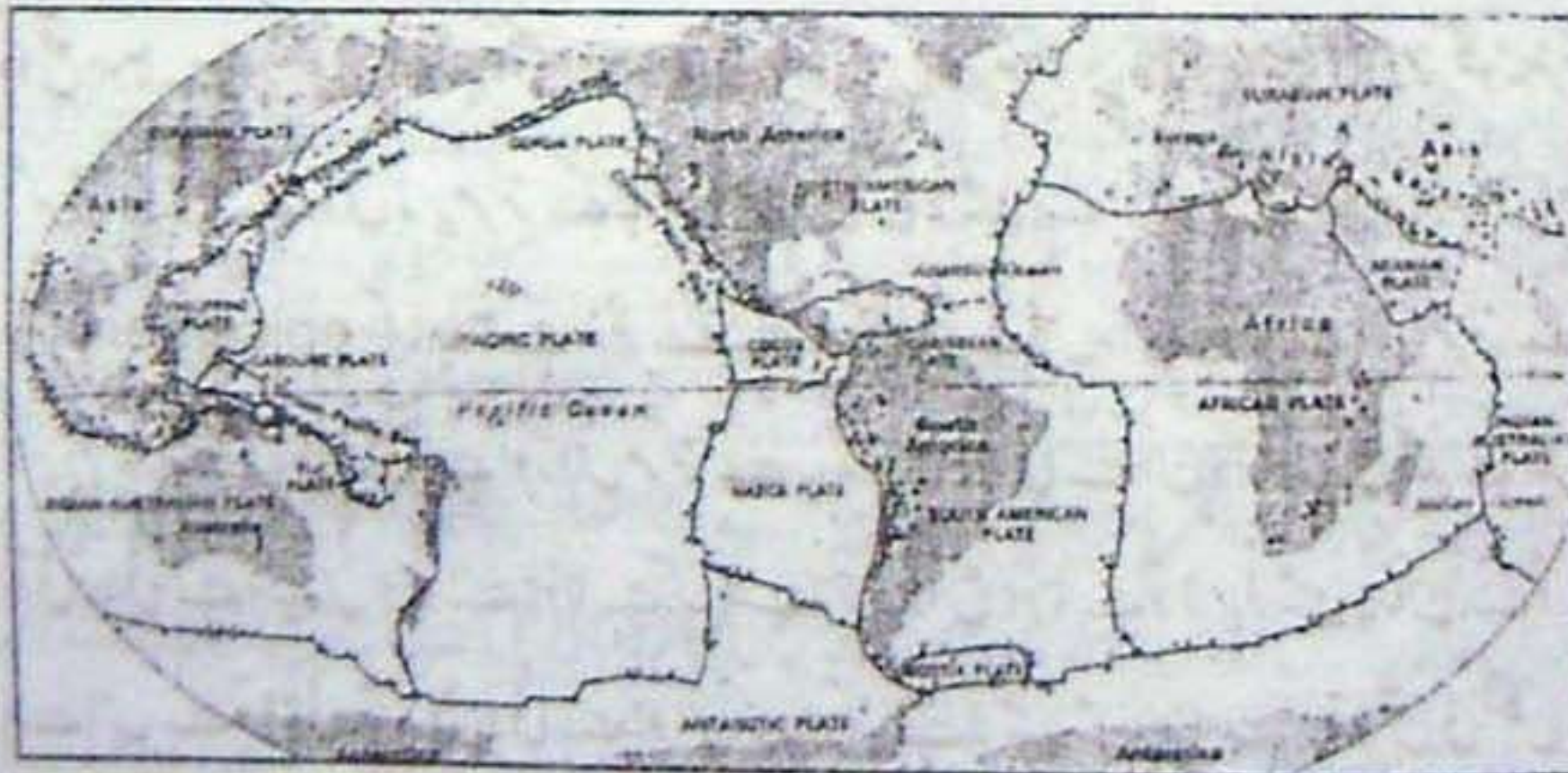
شکل ۴: زلزلے کہاں واقع ہوتے ہیں؟ پچھلے تیس سالوں (۱۹۹۶ء سے) میں واقع ہونے والے بڑے زلزلوں کی نشاندہی، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثر زلزلے ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع ہوتے ہیں۔ اس نقشہ میں ہر نقطہ پچھلے تیس سالوں میں واقع ایک بڑے زلزلے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جبکہ سیاہ خطوط ساختمانی تختیوں کی نشاندہی کررہے ہیں۔

زلزلے کیسے شروع ہوتے اور پھیلتے ہیں؟

جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ اکثر زلزلے ساختمانی تختیوں کی سرحدوں پر واقع رخنہ دار منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، یہ رخنے دراصل کرۂ ارض کے اوپری چٹانی خول یعنی کرۂ حجری میں موجود ہوتے ہیں جہاں اکثر چٹانوں کے مختلف حصے ایک دوسرے پر چڑھ آتے ہیں، لہٰذا یہ رخنے ان چٹانوں کے کم زور منطقوں میں واقع ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر رخنے سطح زمین سے نیچے واقع ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہمیں نظر نہیں آتے، البتہ بعض رخنے سطح زمین پر بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ امریکہ کے شہر کیلی فورنیا کے سان انڈریاس رخنہ San Andreas faults۔

ان رخنہ دار منطقوں میں کبھی دباؤ اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے ان دیوہیکل چٹانوں میں تناؤ پیدا ہوجاتا ہے اور جب اس دباؤ کی وجہ سے ان کا خم اور ٹیڑھاپن اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو یہ چٹان ٹوٹ جاتی ہے، چٹان کے ٹوٹنے کی وجہ سے جو حرکت پذیری پیدا ہوتی ہے، اس سے زمین میں جنبش وارتعاش زلزلیاتی لہروں seismic waves کی شکل میں نمودار ہوکر زلزلہ برپا ہوتا ہے۔

زلزلوں کا نقطۂ آغاز کرۂ ارض کی گہرائیوں میں واقع اس چٹانی پرت میں ہوتا ہے، وہ مقام جہاں اس چٹان میں شگاف واقع ہوکر وہ ٹوٹنے کا سبب بنتی ہے اس کو زلزلہ کا زیر مرکز hypocenter کہا جاتا ہے اور یہ زیر مرکز اکثر زلزلوں میں سطح زمین سے 70 کلومیٹر نیچے واقع ہوتا ہے اور کبھی یہ اور گہرا بھی ہوجاتا ہے، لہٰذا اس زیر مرکز کی آخری انتہا 700 کلومیٹر تک گہری ہوسکتی ہے، اس زیر مرکز کے بالکل متوازی سطح زمین کے اوپر والے نقطہ کو برمرکز یا مرکز زلزلہ epicenter کہا جاتا ہے، زلزلے سے جو جھٹکے آتے ہیں، ان کی شدت اس مرکز کے ارد گرد زیادہ محسوس کی جاتی ہے اور اس مرکز سے بہ تدریج دوری سے ان زلزلوں کی شدت میں کمی آتی جاتی ہے، یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ جب زلزلہ واقع ہوتا ہے تو زیر زمین چٹان کے ٹوٹنے سے اس سے توانائی خارج ہوتی ہے جو اس زیر مرکز سے زمین میں ہر سمت ارتعاش کی شکل میں پھیلتی ہے جس کو زلزلیاتی لہریں seismic waves کہا جاتا ہے اور یہ لہریں جیسے جیسے مختلف سمتوں میں پھیلتی ہیں تو وہ اسی قدر کم زور اور نحیف ہوتی جاتی ہیں، لہٰذا سطح زمین میں ارتعاش کی

شدت میں بھی کمی آتی جاتی ہے، چٹان میں شگاف یا رخنہ پڑنے کا عمل صرف چند سکنڈ کا ہوتا ہے مگر اس شگاف پڑنے کی وجہ سے جو زلزلیاتی لہریں پیدا ہوتی اور پھیلتی ہیں جس کی وجہ سے زلزلہ رونما ہوتا ہے، وہ اگلے تقریباً بیس منٹ تک جاری رہتا ہے۔

زلزلوں سے متعلق بعض اہم اعداد وشمار

جدید تحقیقات کے مطابق سالانہ کل چالیس تا پچاس ہزار چھوٹے زلزلے واقع ہوتے ہیں، ان زلزلوں کو محسوس کیا جاسکتا ہے مگر وہ اتنے شدید نہیں ہوتے کہ کوئی نقصان برپا کرسکیں، البتہ دو سال میں تقریباً ایک شدید ترین زلزلہ واقع ہوتا ہے اور سالانہ 40 متوسط زلزلے واقع ہوتے ہیں جن سے کہیں نہ کہیں جانی ومالی نقصان ہوتا رہتا ہے۔[۱۲]

زلزلوں کی شدت اور ان کے واقع ہونے کے مقام کو متعین کرنے کے لیے ماہرین زلزلیات ایک آلہ استعمال کرتے ہیں جس کو زلزلہ پیما seismograpn کہا جاتا ہے، بعض زلزلے پیما اتنے طاقت ور ہوتے ہیں کہ وہ زمین کے ایک سینٹی میٹر کے دس کروڑویں حصہ کی حرکت کا بھی پتہ اور سراغ لگاسکتے ہیں۔

زلزلوں کی شدت کو ناپنے کا رائج الوقت پیمانہ رچر پیما richter scale ہے، رچر پیما کا ہر عدد اپنے سابقہ نچلے عدد سے دس گنا شدید زلزلہ کی نشان دہی کرتا ہے، مثلاً ۶ جسامت magnitude کا زلزلہ ۵ جسامت والے زلزلے سے دس گنا شدید ہوتا ہے، ماہرین زلزلیات کے مطابق جسامت ۲ کے زلزلے روزانہ ایک ہزار سے زائد رونما ہوتے ہیں، ان کے مطابق جسامت ۵ یا اس سے کم والے زلزلے اتنے نحیف اور کم زور شمار کیے جاتے ہیں جن سے کوئی بڑا نقصان واقع نہیں ہوتا جبکہ جسامت ۷ سے زائد کے زلزلے عظیم تباہی مچاتے ہیں۔

حدیث ابن عباسؓ اور اس کی اعجازی اہمیت

علم طبقات الارض اور زلزلوں کے متعلق ان جدید ترین سائنسی نظریات وحقائق کے جائزے کے بعد آیئے اب ذرا احادیث مبارکہ کا رخ کریں اور دیکھیں کہ اس سلسلے میں اس سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے؟ چنانچہ زلزلوں کے واقع ہونے کے سلسلے میں جو احادیث مروی ہیں ان میں سے ایک حدیث حضرت ابن عباسؓ کی موقوف حدیث (وہ حدیث جو کسی صحابی کی طرف منسوب ہو) ہے، مگر جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ

اس مختصر سی حدیث میں زلزلوں کے واقع ہونے کے اسباب و محرکات کے ساتھ ساتھ علم طبقات الارض کا بنیادی خاکہ بھی سما گیا ہے، ملاحظہ ہو:

اخرج ابن ابی الدنیا فی العقوبات وابو الشیخ فی العظمة عن ابن عباس قال: خلق الله جبلا یقال له (ق) محیط بالعالم وعروقه الی الصخرة التی علیها الأرض، فإذا أراد الله أن یزلزل قریة امر ذلک الجبل فحرک العرق الذی یلی تلک القریة فیزلزلها ویحرکها، فمن ثم تحرک القریة دون القریة. ۵	ابن ابی الدنیا نے عقوبات میں اور ابو الشیخ نے العظمۃ میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جس کا نام "قاف" ہے جو دنیا (زمین) کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کی جڑیں اس چٹان پر ہیں جس پر ہماری زمین قائم ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی قریہ (منطقے) میں زلزلہ لانا چاہتا ہے تو وہ اس پہاڑ کو حکم دیتا ہے تو وہ (پہاڑ) اس منطقے کے نیچے واقع اپنی جڑ کو ہلاتا ہے، لہٰذا وہ (جڑ) اس منطقے کو ہلاتی ہے اور حرکت دیتی ہے، لہٰذا کسی دوسرے منطقے کی بہ نسبت (صرف) اسی منطقے میں زلزلہ رونما ہوتا ہے۔

ایک روایت میں "محیط بالعالم" کے بجائے "محیط بالارض" کے الفاظ آئے ہیں، یعنی یہ پہاڑ (کوہ قاف) ہمارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے، ذخیرہ حدیث میں یہ وہ واحد حدیث ہے جو زلزلوں کے فطری اسباب سے بحث کرتی ہے، البتہ ابو الشیخ بن حیان (م ۳۶۹ھ) نے اپنی کتاب "العظمۃ" میں کوہ قاف کے سلسلے میں اسی معنی اور مصداق کی اور بھی روایات نقل کی ہیں۔

اس حدیث کو روایتی اور درایتی دونوں اعتبارات سے بعض محدثین اور مفسرین نے کم زور قرار دیا ہے اور اس پر اعتراضات عائد کیے ہیں، مگر جدید سائنس نے اس حدیث کے ایک ایک بیان کی تصدیق کر کے اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ یہ حدیث نہ صرف زلزلوں کے متعلق جدید ترین سائنسی نظریات و حقائق کی تصدیق و تائید

کرتی ہے جو کہ اس حدیث کا مرکزی موضوع ہے بلکہ اس میں ضمنی طور پر علم طبقات الارض کے بنیادی نظریات کا ایک خاکہ بھی بہ حسن و خوبی سما گیا ہے، دراصل اس حدیث کی نوعیت اپنی وسعت اور ہمہ گیری میں دریا بہ کوزہ کی مصداق ہے، لہٰذا علم طبقات الارض اپنا جو علمی سفر صدیوں کی علمی چھان بین اور بحث و تحقیق کے بعد طے کر کے آج اس مقام کو پہنچا ہے، ان تمام کو یہ چھوٹی سی حدیث گھیرے اور سمیٹے ہوئے ہے، مندرجہ ذیل بحث میں ہم اس حدیث کے ایک ایک بیان پر علی الترتیب بحث کریں گے اور اس کی علمی اور اعجازی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے۔

کوہِ قاف اور مفسرین و محدثین

سب سے پہلے مذکورہ بالا حدیث کے بالکل پہلے بیان پر بحث کی جاتی ہے جو حسب ذیل ہے:

خَلَقَ اللّٰهُ جَبلاً یُقَالُ لَهٗ (ق) مُحِیطُ بِالأَرْضِ۔	اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ پیدا کیا ہے جس کا نام قاف ہے، جو کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے۔

یہ کوہِ قاف کیا ہے؟ کیا روئے زمین پر ایسا کوئی پہاڑی سلسلہ ہے جو اپنی وسعت میں اتنا عظیم الشان ہو کہ وہ ہمارے پورے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہو، محدثین کے ساتھ ساتھ مفسرین میں بھی شروع دور ہی سے اس پر کافی بحث ہو چکی ہے، کیوں کہ اس حدیث کا تعلق ایک قرآنی آیت سے بھی ہے جو سورۂ قاف کی پہلی آیت ہے:

ق، والقرآن المجید (ق:۱)	ق، قسم ہے قرآن مجید کی۔

اس آیت کی تفسیر میں کبار صحابہ اور تابعین کا قول ہے کہ اس میں ق سے مراد یہی کوہِ قاف ہے جس کا تذکرہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں کیا گیا ہے، لہٰذا حضرت عبد اللہ بن بریدہؓ، مجاہدؒ، ضحاکؒ، مقاتلؒ اور خود حضرت ابن عباسؓ کے مطابق اس آیت میں (ق) سے مراد یہی کوہِ قاف ہے جو ہمارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے[۶]، شاید یہی وجہ ہے کہ اس حدیث میں باوجود روایتی و درایتی نقص کے تقریباً تمام ہی مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اس حدیث کو پیش کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس حدیث کی درایت پر بحث کرتے ہوئے اس کو کم زور اور غیر معقول قرار دیا ہے، جن میں علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)، قرافی (م ۲۹۹ھ) اور علامہ آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ)

قابل ذکر ہیں، ابن کثیر نے اس حدیث کو غیر معقول قرار دیتے ہوئے اس کو اسرائیلیات کی دین قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اس حدیث کے راویوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ ۷

قرآنی کے مطابق اس پہاڑ کا کوئی وجود نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے کرۂ ارض کے بر و بحر کا شمال تا جنوب اور مشرق تا مغرب کئی بار چکر لگایا مگر انہیں کہیں اس پہاڑ کا سراغ نہیں ملا، لہذا یہ حسی شہادت اس حدیث کی بطلان کے لیے کافی ہے، ان کے مطابق کسی ایسی چیز کا اعتقاد رکھنا جس کی کوئی دلیل نہ ہو جائز نہیں ہے۔ ۸

علامہ آلوسی بغدادی نے انا کہ اگر چہ اس حدیث کی سند میں بعض ایسے راوی ہیں جو ثقہ اور عادل ہیں، باوجود اس کے یہ حدیث درایتی اعتبار سے صحیح نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اول تو کوہ قاف کا وجود نہیں ہے اور دوم یہ کہ اگر بالفرض اس کو کہیں مان بھی لیا جائے تو بھی زلزلوں کا آنا اس پہاڑ پر موقوف نہیں ہوسکتا، کیوں کہ زلزلوں کا آنا سطح زمین کے نیچے درجۂ حرارت اور بھاپوں کے جماؤ اور ان کے سطح زمین کی طرف نکلنے کی سعی وجہد کی وجہ سے ہوتا ہے، لہذا ان کے مطابق اس علمی حقیقت کا انکار علمی مکابرہ کی قبیل سے ہوگا۹، علامہ آلوسی کے اس بیان پر بحث اس مضمون میں آگے آئے گی۔

محدثین ابوالشیخ کی مرویات کو بالعموم ناقابل التفات سمجھتے ہیں اور ان کی مرویات کو صحت وصداقت کے اعتبار سے بالکل آخری درجے میں رکھتے ہیں، ان کے مطابق ان کی روایات کا ماخذ غلات اور متصوفین اور افسانہ گو ہوتے ہیں ۱۰، البتہ محدثین میں علامہ ابن حجر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اس حدیث کے رواۃ میں بعض ثقہ اور قابل اعتماد راویوں کے ہونے کی بات کہتے ہوئے فرمایا ہے کہ کسی صحابی کا قول صحیح کا حکم حدیث مرفوع الی النبی ﷺ کی طرح ہی ہوتا ہے۔ ۱۱

کوہ قاف کے سلسلے میں مفسرین اور محدثین کی اس معرکۃ الآرا بحث سے دراصل یہ باور کرنا مقصود ہے کہ احادیث کی صحت وصداقت کو جانچنے کے لیے انہوں نے کتنی دقت اور باریک بینی سے کام لیا اور ان کو جانچنے میں روایت کے ساتھ ساتھ درایت حدیث کو بھی بڑی حد تک ملحوظ رکھا، جدید سائنس کی روشنی میں درایت حدیث پر بحث اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ ہو۔

کوہ قاف کہاں ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارے روئے زمین پر واقعی ایسا

کوئی پہاڑ یا پہاڑی سلسلہ بھی موجود ہے جو اس قدر دیوہیکل ہو کہ اس کی وسعت سے کرۂ ارض ڈھک جائے؟ اس سلسلے میں مستشرقین بھی اپنی خامہ فرسائی سے نہیں چوکے، لہذا انہوں نے حدیث شریف کے اس بیان اور مذکورہ بالا قرآنی آیت کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس کو قرآن اور حدیث کے سائنسی اغلاط scientific errors میں شمار کیا ہے۔

لہذا آیئے اب علم طبقات الارض کے جدید انکشافات کی روشنی میں اس کوہ قاف کا پتہ لگانے کی کوشش کریں کہ کیا روئے زمین پر ایسا کوئی پہاڑی سلسلہ ہے جو حدیث شریف کی اس تعریف پر پورا اترتا ہو، روئے زمین پر کئی بڑے پہاڑ اور پہاڑی سلسلے پائے جاتے ہیں جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:

۱- اپالیچین پہاڑیاں Appalachian Mountains: یہ براعظم شمال امریکہ میں واقع ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے الباما ریاست سے کینیڈا کے Newfoundland تک پھیلا ہوا ہے، اس کی وسعت 3,100 کلومیٹر ہے۔

۲- انڈس پہاڑیاں Andes Mountains: یہ براعظم جنوبی امریکہ کے پورے مغربی ساحل پر پھیلا ہوا ہے، اس کی وسعت 7,200 کلومیٹر ہے۔

۳- حلقۂ آتشیں The ring of fire: یہ بحر الکاہل کو گھیرے ہوئے ہے، کوہ انڈس Andes اور بحر الکاہل کا پہاڑی سلسلہ اس کا حصہ ہے، جاپان، فلپائن، انڈونیشیا اور نیوزی لینڈ کے آتش فشانی پہاڑ بھی اسی سلسلہ کا حصہ ہیں۔

۴- ٹیتھین پہاڑی سلسلہ The Tethyan Mountain System: یہ جنوبی یوروپ اور افریقہ سے ایشیا تک پھیلا ہوا ہے، اس کی وسعت 11,000 کلومیٹر ہے، اس پہاڑی سلسلے میں شمال مشرقی افریقہ کی اٹلس Atlas پہاڑیاں، یوروپ کی الپس Alps اور کارپاتھین Carpathian پہاڑیاں، یوروپ اور ایشیا کے درمیان میں واقع کوہ قفقاز Caucasus Mountains کے ساتھ ساتھ ایشیا کے زغروس Zagros پہاڑیاں، پامرس Pamirs، سلسلۂ کاراکورم Karakoram Range اور ہمالیہ Himalayas کا پہاڑی سلسلہ بھی شامل ہے۔ ۱۲

تو ظاہر ہے کہ ہمارے ان معروف پہاڑی سلسلوں میں ایسا کوئی پہاڑی سلسلہ نہیں ہے

جس پر کوہ قاف کا اطلاق کیا جاسکے کہ وہ اپنی ہیئت و ماہیت میں کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہو، کیوں کہ ہمارے کرۂ ارض کا محیط circumference تقریباً چالیس ہزار کلومیٹر ہے جبکہ روئے زمین پر پایا جانے والا سب سے لمبا پہاڑی سلسلہ ٹیتھیین پہاڑی سلسلہ ہے جو صرف ۱۱،۰۰۰ کلومیٹر لمبا ہے، کوہ قفقاز کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ وہی کوہ قاف ہے مگر جیسا کہ بتایا جاچکا کہ وہ تنہا پہاڑ تو کجا وہ پورا پہاڑی سلسلہ جس کا کہ وہ حصہ ہے، اس کا اطلاق حدیث شریف میں مذکور کوہ قاف پر نہیں کیا جاسکتا۔

کوہ قاف کا انکشاف جب ان معروف پہاڑی سلسلوں میں سے کسی پر بھی کوہ قاف کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق کس پر کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ایسا پہاڑی سلسلہ ہمارے کرۂ ارض پر موجود ہے جو بیسویں صدی عیسوی تک انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہا! بیسویں صدی کی تابڑ توڑ جیولوجیائی تحقیقات نے ایک ایسے سلسلہ کوہ کا پتہ لگایا ہے جو اپنی ہیئت، وسعت اور عظمت میں انتہائی ہیبت ناک ہے، یہ پہاڑی سلسلہ حدیث شریف میں مذکور کوہ قاف کی تعریف پر پورا اترتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ جدید جیولوجیائی تحقیقات نے اس پہاڑی سلسلے کی اس جیولوجیائی اہمیت کو بھی اجاگر کردیا ہے، جس کا تذکرہ اس حدیث شریف میں کیا گیا ہے۔

یہ پہاڑی سلسلہ دراصل کرۂ ارض پر واقع عظیم سمندروں کے بیچوں بیچ واقع ہے، اس پہاڑی سلسلہ کا انکشاف ۱۹۵۰ء کے دہے میں سونار تصویر کشی sonar imaging ٹکنالوجی کے ذریعہ ممکن ہوسکا، جو زیر آب زمین اور سمندری فرش کے جغرافیا کا آواز کی لہروں کے ذریعہ مطالعہ اور تصویر کشی کرتی ہے، چوں کہ یہ گہرے سمندر (جن کی گہرائی اوسطاً چار تا چھ کلومیٹر ہے) صرف چند سومیٹر کے بعد اس قدر تاریک اور سیاہ ہوگئے ہیں کہ ان کو سادہ آنکھوں سے دیکھنا اور عام طور پر مستعمل کیمروں کی مدد سے ان کی تصویر کشی کرنا ممکن نہیں ہے۔

اس پہاڑ کا نام وسط سمندری ریڑھ Midoceanic Ridge یا صرف Oceanic Ridge ہے[۱۳]، یہ پہاڑی سلسلہ کرۂ ارض پر واقع سمندری تہہ کی سب سے اہم خصوصیت ہے، یہ پہاڑی سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ کرۂ ارض پر واقع تمام سمندروں میں پھیلا ہوا ہے، جو ایک طرف بحر منجمد Arctic Ocean سے شروع ہو کر شمالی بحر اوقیانوس North Atlantic Ocean،

جنوبی بحر اوقیانوس South Atlantic Ocean، بحر قطب جنوبی Antartic Ocean، بحر ہند Indian Ocean، جنوبی بحر الکاہل South Pacific Ocean اور پھر شمالی بحر الکاہل North Pacific Ocean تک پھیلا ہوا ہے، یہ پہاڑی سلسلہ اپنی شکل و ہیئت میں بالکل ایک اژدھے کی طرح ہے جو ہمارے تمام سمندروں کے ساتھ ساتھ تمام براعظموں کو گھیرے ہوئے ہے، لہذا انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نے کوہ قاف کی حسب ذیل تعریف کی ہے:

Oceanic ridge are linear mountain chains comprising the largest features on earth. They are found in every ocean basin and appear to griddle the earth. The ridges rise from depths near 5 kilometers to an essentially uniform depth of about 2.6 killometers...... They can be thousands of killometers wide. [۱۴]

"سمندری ریڑھیں قطاری پہاڑی سلسلے ہیں جو روئے زمین کی سب سے بڑی خصوصیت ہیں، وہ تمام سمندری فرشوں پر پائے جاتے ہیں اور کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہیں، یہ ریڑھیں ۵ کلومیٹر گہرائی سے لے کر تقریباً 2.6 کلومیٹر کی اوسط گہرائی سے نمودار ہوئے ہیں...... اور ان کی چوڑائی ہزارہا کلومیٹر تک ہوسکتی ہے"۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مذکورہ بالا بیان سے جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ یہ کہ کوہ قاف کی دیو قامت اور عظمت کے سلسلے میں جو الفاظ حدیث شریف میں وارد ہوئے ہیں کہ "وہ ہمارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے" اس میں بھی بالکل وہی الفاظ مستعمل ہوئے ہیں، اس سلسلے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مزید بیانات ملاحظہ ہوں:

Continuous submarine mountain chain extending approximately 80,000 km (50,000 miles) through all the world's oceans. [۱۵]

"غیر منقطع آب دوزی سلسلہ کوہ جو تقریباً 80,000 کلومیٹر (50,000 میل)

لمبا ہے اور کرۂ ارض کے تمام سمندروں میں پھیلا ہوا ہے"۔

The midocean ridge system is the largest feature on the Earth's surface after continents and the ocean basins. It's volume exceeds 100,000,000 cubic kilometers (25,000,000 miles), and, if it did not exist, sea level would occur at more than 250 meters (800 feet) lower than it does. [۱۲]

"وسط سمندری سلسلہ ریڑھ سطح زمین پر براعظموں اور سمندروں کے بعد تیسری اہم خصوصیت ہے، اس کا حجم ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ مکعب کلومیٹر (۲۵،۰۰۰،۰۰۰ میل) سے زائد ہے اور اگر اس کا وجود نہ ہوتو سمندری سطح (سمندری پانی کی سطح) اس کی موجودہ سطح سے ۲۵۰ میٹر (۸۰۰ فٹ) اور نیچے ہوتی"۔

اس پہاڑی سلسلے کی پر ہیبت تصویر ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا ۱۴/ ۳۹۶ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جس سے اس پہاڑی سلسلہ کی حقیقی ہیبت کا اندازہ مشاہدہ ہوسکتا ہے، اس پہاڑی سلسلہ کی لمبائی اور سمندروں میں اس کی گزرگاہ کو مندرجہ ذیل شکل نمبر ۵ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔

Courtesy: U.S. Geological Survey
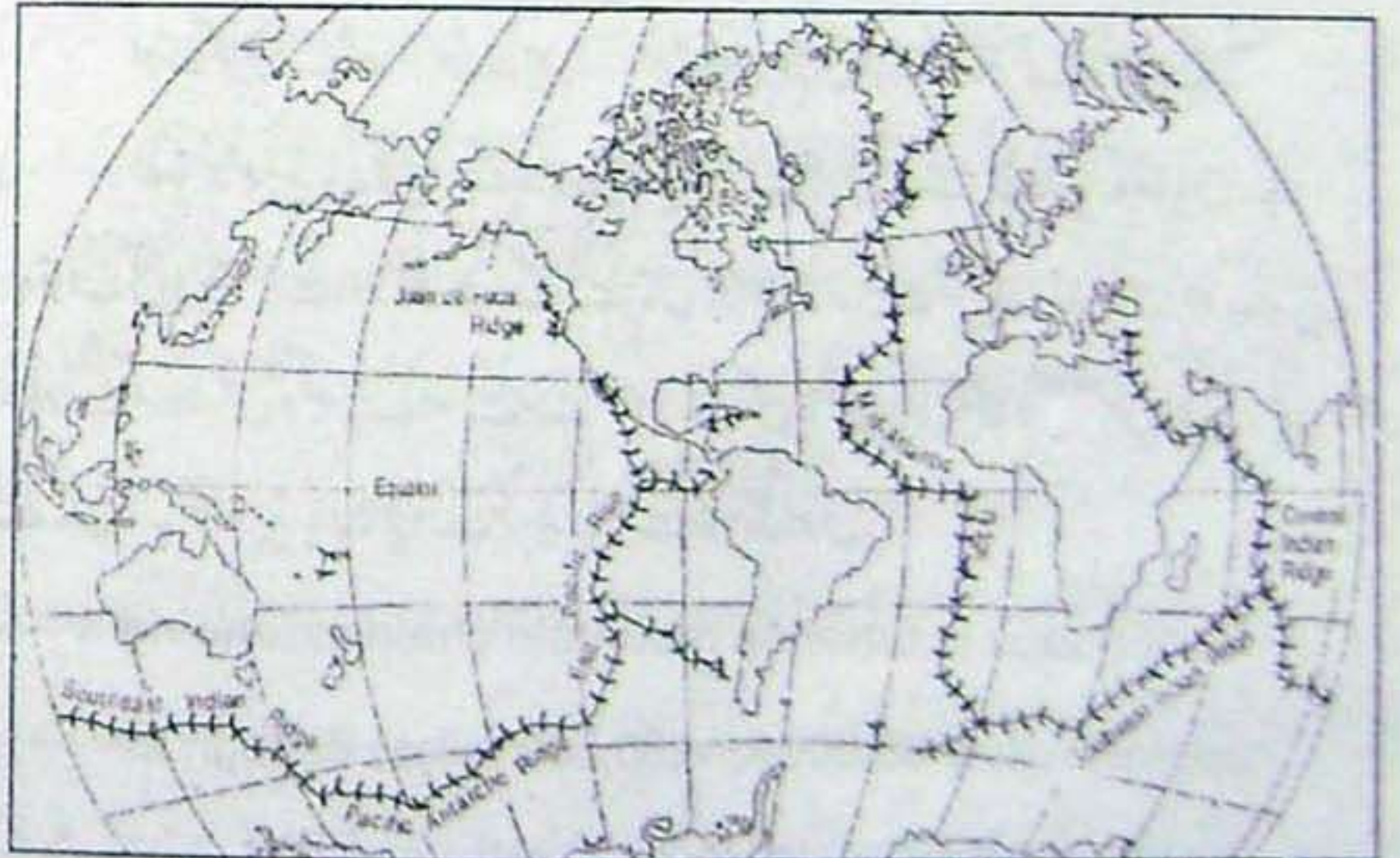
شکل ۵: سمندروں کے بیچوں بیچ واقع کوہ قاف یا وسط سمندری ریڑھ midoceanic ridge کا عظیم الشان پہاڑی سلسلہ جو اپنی شکل و ہیئت میں ہمارے کرۂ ارض کو گھیرے ہوئے ہے

اس پہاڑی سلسلے کی لمبائی تقریباً پچاس ہزار میل (۸۰،۰۰۰،۰۰۰ ہزار کلومیٹر) ہے، اگر اس پہاڑی سلسلے کو ہمارے کرۂ ارض پر سیدھے سیدھے تان دیا جائے تو یہ کرۂ ارض کے محیط circumference کا تقریباً دوگنا ہوجائے گا، کیوں کہ ہمارے کرۂ ارض کا محیط تقریباً چالیس ہزار کلومیٹر ہے، روئے زمین پر واقع ہمارے تمام معروف پہاڑی سلسلوں کو اگر ملا بھی دیا جائے تو وہ اس وسط سمندری ریڑھ یا کوہ قاف کے حجم اور لمبائی کا مقابلہ نہیں کرسکتے، اس وسیع اور عظیم سلسلہ کوہ کو سائنس دانوں نے ان کے مختلف سمندروں میں گزرنے کے لحاظ سے مختلف نام دیے ہیں، مثلاً وسط اوقیانوسی ریڑھ Mid-Atlantic Ridge، شرقی بحرالکاہل ریڑھ East-Pacific Ridge، وسط بحر ہند ریڑھ Mid-Indian Ridge وغیرہ، اس وسط بحری ریڑھ کے اکثر سلسلہ 1500 میٹر (1.5 کلومیٹر) اونچے ہیں، البتہ ان کی بعض پہاڑی چوٹیاں بعض جگہوں پر اس قدر اونچی ہوگئی ہیں کہ وہ سطح سمندر سے اوپر بھی نکل آئی ہیں اور انہوں نے جزیروں کی شکل اختیار کرلی ہے، مثلاً بحر اوقیانوس میں جزیرۂ ازورس Azores اور برفانی جزیرہ Iceland وغیرہ۔

بہرحال حدیث شریف اور وہ بھی ایک صحابی کی زبان سے ہمارے روئے زمین پر واقع ایک ایسی حقیقت کا اظہار آج سے چودہ سو سال قبل کیا جارہا ہے، جس کا مشاہدہ آج بھی سادہ آنکھوں سے ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کو تو جدید ترین آلات سے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اس قسم کی غیبی خبریں دراصل ساری انسانیت کے لیے ایک انتباہ عظیم ہیں کہ ذریعہ علم محض اعضا محسوسہ سے حاصل ہونے والا علم ہی نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ایک اور ذریعہ یعنی کہ وحی بھی ہے، اصولی اعتبار سے ایک صحابی رسول ﷺ کا قول صحیح بھی حدیث مرفوع الی النبی ﷺ کا درجہ رکھتا ہے اور احادیث رسول کا ماخذ وحی الٰہی ہے، اس طرح علم حدیث اور اصول حدیث کی صحت، صداقت پر آج جدید سائنس نے علمی اور عقلی دلائل بھی فراہم کردیے ہیں۔

کرۂ حجری lithosphere کا اثبات

کوہ قاف کے انکشاف کے بعد اب آیئے اس حدیث کے اگلے بیان کی طرف جس میں علم طبقات الارض کے بعض دوسرے اہم ترین حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لہٰذا اس حدیث کا اگلا ٹکڑا ہے:

وعروقه الى الصخرة التي

اور اس (کوہ قاف) کی جڑیں اس چٹان پر

ہیں جس پر ہماری زمین قائم ہے۔

علیھا الارض

حدیث شریف کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دراصل علم طبقات الارض کا پورا فلسفہ سما گیا ہے، لہذا حدیث کے اس مختصر ٹکڑے میں دو اہم ترین جیولوجیائی نظریات کا اثبات ہو رہا ہے، ان میں سے پہلا پہاڑوں کی تشکیل کا فلسفہ ہے اور دوسرا کرۂ حجری lithosphere کے وجود کا اشارہ، ہم یہاں پہلے اس کے دوسرے حصہ سے بحث کریں گے جس کو سمجھ لینے کے بعد پہلے حصہ کو بھی سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ علم طبقات الارض کے جدید ترین نظریات کے مطابق ہمارے کرۂ ارض کو چار جیولوجیائی پرتوں geological layers میں بانٹا گیا ہے جس کی تفصیلات گزر چکی ہیں، لہذا ان چار پرتوں میں سے سب سے اوپری پرت قشر ارض Crest اور دوسری پرت غلاف ارض mantle کی اوپری تہہ ٹھوس چٹانوں پر مشتمل ہے، قشر ارض اور غلاف ارض کی اس مشترکہ چٹانی پرت کو کرۂ حجری کہا جاتا ہے، یہ کرۂ حجری ہمارے کرۂ ارض کے اندرون کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور اس کی موٹائی ہر جگہ اوسطاً تقریباً سو کلومیٹر ہے، یہی کرۂ حجری تیس بڑے اور دیوہیکل ساختمانی تختیوں یا ٹکڑوں کی شکل میں بنا ہوا ہے اور اس کے نیچے واقع کرۂ آتشیں asthenosphere پر تیر رہا ہے:

The outermost part of the earth consists of a fairly rigid layer called the lithosphere, which consists of the crest and the top layers of the mantle. It floats on a yielding layer beneath it, termed the asthenosphere [۱۷]

"کرۂ ارض کا بالکل اوپری حصہ ایک انتہائی سخت تہہ پر مشتمل ہے جس کو کرۂ حجری کہا جاتا ہے، جو قشر ارض اور غلاف ارض کی اوپری تہوں پر مشتمل ہے، یہ اس کے نیچے واقع ایک نرم تہہ پر تیر رہا ہے جس کو کرۂ آتشیں کہا جاتا ہے"۔

The plates that move around on the earth's surface are made of more than the thickness of the crest.

They include the uppermost part of the mantle. The plate is called lithosphere and is everywhere about 100 km (62 miles) thick. Oceanic lithosphere has oceanic crust at the top which is only about 5 km (3 miles) thick. Continental lithosphere has continental crust above, which is thicker-35 km (21 miles.) [۱۸]

"ساختمانی تختیاں جو سطح زمین کے اردگرد گھومتی رہتی ہیں وہ دراصل قشر ارض کے علاوہ پر بھی مشتمل ہوتی ہیں، لہذا ان میں غلاف ارض کا اوپری حصہ بھی شامل ہے، اس تختی کو کرۂ حجری کہا جاتا ہے جو ہر جگہ سو کلومیٹر (۶۲ میل) موٹی ہے، بحری کرۂ حجری کے اوپری حصہ میں بحری قشر ارض ہے جو صرف پانچ کلومیٹر (۳ میل) موٹا ہے، بحری کرۂ ارض کے اوپری حصہ میں بحری قشر ارض ہے جو ۳۵ کلومیٹر (۲۱ میل) موٹا ہے"۔

کرۂ حجری کی ہیئت کو شکل نمبر ۱ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، اس کی ایک اور سادہ ہیئت کو مندرجہ ذیل شکل نمبر ۶ میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

شکل ۶ کرۂ حجری lithosphere کی اندرونی ہیئت اور موٹائی جو ہمارے کرۂ ارض کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اور اس کی موٹائی زمین کے چاروں طرف اوسطاً سو کلومیٹر ہے۔ اس کرۂ حجری کی اوپری سطح سے ہمارے براعظم اور سمندر جڑے ہوئے ہیں

سطح زمین پر واقع ہمارے عظیم الشان براعظم اور سمندر اس کرۂ حجری کی اوپری سطح سے جڑے ہوئے ہیں، اس علمی حقیقت کو حدیث شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ ہماری زمین (کرۂ ارض کی اوپری پرت جس میں پہاڑ، سمندر اور براعظم وغیرہ آتے ہیں) اس چٹان پر قائم ہے۔ (باقی)

مراجع وحواشی

ل The New Book of Popular Science, Vol.2, P.29, Grolier Incorporated, 1987
۲ ان کی تفصیلات کے لیے علم طبقات الارض کی کسی بھی کتاب سے رجوع کیا جاسکتا ہے ۳ تفصیلات کے لیے ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا یا علم طبقات الارض کی کوئی بھی کتاب ملاحظہ ہو ۴ World Book Encyclopaedia, Vol.6, P.33, 1996 Edition. ۵ العقوبات، ابن ابی الدنیا (م ۲۸۱ھ) تحقیق: محمد خیر رمضان یوسف، حدیث نمبر ۲۳، دار ابن حزم، ۱۴۱۶/۱۹۹۶ (نسخہ کمپیوٹر) العظمة، ابو الشیخ بن حیان (م ۳۶۹ھ) تحقیق: رضاء اللہ بن محمد ادریس مبارک پوری، ۴/۱۴۸۹، دار العاصمة، ریاض، طبع اول، ۱۴۰۸ (نسخہ کمپیوٹر)، الهيئة السنية، جلال السیوطی، ص ۳۱، مخطوطات مکتبة الازہر الشریف، مخطوطہ نمبر ۳۲۰۱۴۹ ۶ ملاحظہ ہو: الدر المنثور فی التفسیر بالماثور، سیوطی، ج ۷، ص ۵۸۹، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۳، تفسیر الماوردی، ماوردی بصری، ج ۵، ص ۳۳۹، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۱۹۹۲ ۷ تفسیر ابن کثیر: ج ۷، ص ۲۲۱، مکتبة دار التراث، قاہرہ ۸ روح المعانی، آلوسی، ج ۲۶، ص ۱۷۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۹ حوالہ سابق ۱۰ علوم الحدیث، ڈاکٹر صبحی صالح، ترجمہ پروفیسر غلام احمد حریری، ص ۱۵۲، ملک سنز پبلیشرز، فیصل آباد، ۱۹۷۸ ۱۱ روح المعانی، آلوسی، ج ۲۶، ص ۱۷۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۲ World Book Encyclopaedia, Vol.13, P.667 ۱۳ پہلے اس سلسلہ کوہ کا نام وسط سمندری ریڑھ mid-oceanic ridge رکھا گیا تھا مگر چوں کہ یہ سمندری ریڑھیں ہر جگہ وسط سمندر میں واقع نہیں ہیں جیسا کہ سب سے بڑی ریڑھ مشرقی بحر الکاہل ریڑھ East-Pacific Ridge کا حال ہے جو پوری طرح وسط سمندری نہیں ہے، اس لیے اس کا نام بعد میں صرف سمندری ریڑھ oceanic ridge میں بدل دیا گیا ۱۴ Encyclopaedia Britannica 2001 Deluxe Edition CD-ROM, article: Ocean: Oceanic Ridges ۱۵ Ibid article: oceanic ridges ۱۶ The Encyclopaedia Britannica Vol 13 P.472, 1983 ۱۷ Planet Earth, P.52, The World Book Encyclopaedia of Science, Chicago, 1996 ۱۸ Eyewitness Science Earth P.40 Dorling Kindersley London, 1999

مولانا ابوالکلام آزاد پر
علامہ شبلی کے اثرات

از:- ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ☆

علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان بڑے قریبی تعلقات تھے، ان علمی تعلقات کا عکس ''الہلال'' کے صفحات پر دیکھا جاسکتا ہے اور خود ''حیات شبلی'' کے آئینہ میں علامہ شبلی سے مولانا آزاد کے تعلقات پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں، ''مکاتیب شبلی'' میں علامہ شبلی کے چالیس خطوط دونوں کے علمی تعلقات پر شاہد عدل ہیں، اسی طرح وہ مکاتیب ہیں جو مولانا آزاد نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام لکھے ہیں، ان میں علامہ شبلی، دار المصنفین اور خود مولانا سید سلیمان ندوی سے مولانا آزاد کی عقیدت، تعلق اور علمی روابط کا اندازہ ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مولانا آزاد پر سب سے زیادہ سرسید کی تحریروں کا اثر پڑا اور انہوں نے سرسید کا پورا لٹریچر پڑھ ڈالا، اس مطالعہ سے آزاد کے اندر تعقل پرستی پیدا ہوئی، ان کا انداز نظر سائنٹفک ہوگیا، وہ ہر چیز کو عقل کے آئینہ میں دیکھنے لگے اور عقل ان پر غالب آگئی، بعد میں جب مولانا آزاد نے علامہ ابن تیمیہ حرانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے لٹریچر کا مطالعہ کیا اور ان سے تاثر قبول کیا تو سرسید کے اثرات مدھم پڑ گئے اور ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے اثرات غالب آگئے، علامہ شبلی کی راہ بھی دراصل ابن تیمیہ کی راہ تھی، اس بنا پر جب مولانا ابوالکلام آزاد علامہ شبلی کے ساتھ لکھنؤ آکر ندوہ میں چھ ماہ قیام پذیر رہے اور علامہ شبلی نے ان کو ''الندوہ'' کا نائب اڈیٹر مقرر کردیا تو اس وجہ سے مولانا آزاد نے اس طویل فیض صحبت سے نفع اٹھایا اور وہ مولانا شبلی کے خیالات سے متاثر ہوئے، مولانا ابوالکلام آزاد پر جو اثرات علامہ شبلی کے ساتھ رہنے سے پڑے ان کی داستان

☆ سابق ڈین، پروفیسر وصدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونی ورسٹی، کیرلا۔

"حیات شبلی" میں خود مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ملاحظہ فرمایئے جس میں حضرت سید الطائفہ نے بڑی جامعیت اور بڑے ایجاز سے ان تعلقات کا خلاصہ بیان فرمادیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی "الندوہ" کے سب اڈیٹر رہے، اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنادیا، شبلی مرحوم ان کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانہ تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا، وہ ان کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مشتیٔ فطری صلاحیتوں کی یہ دولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے، یہیں انہوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے، جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کرگیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر "الہلال" میں نظر آیا"۔

مولانا ابوالکلام نے "الندوہ" میں پہلا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ" لکھا جو اکتوبر ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد المرأۃ المسلمۃ کے نام سے مصر کے قاسم امین بک اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے، یہی سلسلہ تحریر ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا اور ہر طرف مولانا شبلی سے ان کی نسبت استفسار ہونے لگا، اس قسم کے ایک خط کے جواب میں مولانا لکھتے ہیں:

"آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے معلومات یہاں رہنے سے ترقی کرگئے ہیں"۔ (خطوط بنام مہدی نمبر ۱۹)

الندوہ میں ان کے مضامین نے ان کے نام کو ہر طرف پھیلادیا اور اخباروں اور رسالوں سے ان کی مانگ شروع ہوگئی، آخرکار وہ ۱۹۰۶ء میں وکیل، امرت سر میں چلے گئے اور قریباً دو سال وہاں رہے ہوں گے، اسی اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابو النصر غلام یاسین صاحب آہ کا عراق میں جہاں وہ سیر وسیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوگیا اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیرالدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزارہا مرید تھے وفات پائی،

رحلت کے وقت انہوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا، اب انہوں نے امرت سر چھوڑ کر پہلے بمبئی میں پھر کلکتہ میں قیام کیا اور ہدایت وارشاد خلق میں مصروف ہوئے، آخر ۱۹۱۲ء میں انہوں نے "الہلال" نکالا اور جس طرح نکالا اور اس نے اسلامی سیاسیات پر جو اثر ڈالا اور اس کے بعد کے واقعات سب کے سامنے ہیں لیکن اتحاد اسلامی ووطنی سیاست میں کانگریس کی ہم رہی، جس صحبت کا فیض ہے وہ اس سوانح کے اوراق سے ظاہر ہے"۔ (حیات شبلی، ص ۴۴۳ تا ۴۴۵)

آخری جملہ میں حضرت سید سلیمان ندوی نے وضاحت سے بتادیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی کانگریس میں شمولیت علامہ شبلی کے فیض صحبت اور ان کے افکار سے تاثر کا نتیجہ ہے لیکن مجھے اس امر پر سخت تعجب ہے کہ مولانا آزاد پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے مگر کسی نے مولانا آزاد پر علامہ شبلی کے اثرات سے بحث نہیں کی حتی کہ "نقد ابوالکلام" کے مصنف نے اپنی ضخیم تصنیف میں علامہ شبلی اور مولانا آزاد کے تعلقات پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔

علامہ شبلی کا سیاسی نظریہ

سرسید اور علامہ شبلی کے درمیان بنیادی اختلاف یہی تھا کہ سرسید اپنے دور کے حالات کے تقاضے سے اور مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے باعث چاہتے تھے کہ مسلمان صرف تعلیم حاصل کریں اور ملک کی سیاسی جدوجہد میں حصہ نہ لیں، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ چوں کہ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور انگریزوں کے خلاف ہر جگہ پورے ملک میں مسلمانوں نے مورچے قائم کیے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں ان کا رول بڑا نمایاں تھا لہذا سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان کانگریس میں شامل ہوکر انگریزوں کی دشمنی مول نہ لیں اور تعلیم میں اور پیچھے نہ چلے جائیں، سرسید کے جانشین وقار الملک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

"ہم نیشنل کانگریس میں شریک ہوجائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہوجائے گی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جائے"۔ (مقالات شبلی ہشتم، ص ۱۳۷)

علامہ شبلی جواباً فرماتے ہیں:

"اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے ۵ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی

ہے، اگر دادا بھائی نوروزی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے پہلے پارلیمنٹ کا ممبر ہوسکتا ہے، اگر گوکھلے تہا ریفارم اسکیم کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو پانچ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہیے — بات بالکل صحیح ہے کہ پولیٹکل خواب سے بیدار ہونے کا وقت آگیا ہے ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس چیز کو ہم پالیٹکس سمجھتے تھے وہ پالیٹکس کی تحقیر تھی، ہماری پالیٹکس کا کعبہ دراصل بت کدہ تھا، ہمارے پالیٹکس جس کی آواز کلمہ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی ہم کو پالیٹکس کے قابل بننا چاہیے، ہماری مقدار کم ہے اس لیے نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں، اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دہراتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدوجہد، سعی وکوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس سے عام سناٹا چھا گیا"۔

علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ:

ذرا ہندوؤں کو دیکھیے، گروکل میں ۳۰۰ وہ بچے تعلیم پارہے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی قوم کے ہاتھ فروخت کردیا ہے اور جو باوجود (دولت مندی کے زمین پر سوتے ہیں اور کمبل اوڑھتے ہیں، ہم اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ آریہ کالج اور ہندو کالج میں متعدد پروفیسر ہیں جو بغیر کسی معاوضہ کے کام کرتے ہیں لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں، پرجوش نمونے اور یہ تمام عبرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک ذرہ جنبش پیدا نہیں کرسکتے، ہماری قومی درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی، ہمارا قومی گریجویٹ قومی کام میں نرخ بازار سے ایک حبہ اپنی قیمت کم نہیں کرتا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہمارا پولٹکل احساس مرگیا ہے"۔ (مقالات شبلی ہشتم ص ۳۹)

پھر مولانا علی گڑھ تحریک کے مقصد پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دنیا میں

صرف آئیڈیل (مطمح نظر) ایک چیز ہے جو انسان کے جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کرسکتی ہے، ہمارا آئیڈیل کیا ہے؟ ہم نے کس چیز کو تاکا ہے؟ ہمارا کیا منتہائے خیال ہے؟ بی-اے اور نوکریاں، کیا اس آئیڈیل سے قوم میں کسی قسم کے پرزور جذبات پیدا ہوسکتے ہیں؟ کیا اتنی سی بات کے لیے زحمتیں برداشت کی جاسکتی ہیں؟ کیا یہ مقصد کوئی بڑا ولولہ دل میں پیدا کرسکتا ہے؟ کیا اس ذوق میں فرش خاک پھولوں کی سیج بن سکتا ہے؟۔ (ایضاً، ۱۳۹)

اس پست مقصد سے سخت نقصان یہ ہوا کہ تمام قوم کی قوم میں پست حوصلگی، جبن، بزدلی چھاگئی، ہمارے پولیٹکل لغت نے جائز آزادی کا نام بغاوت رکھ دیا، ایک پارسی یا ہندو کانگریس میں جاتا ہے، انتظام حکومت سے نکتہ چینی کرتا ہے اور پھر پارلیمنٹ اور وائسرائے کونسل کا ممبر باقی رہتا ہے لیکن مسلمان ایجوکیشنل کانفرنس میں آتے گھبراتے ہیں اور سرسید سے فتویٰ پوچھتے ہیں، یہاں تک کہ مرحوم کو علی گڑھ گزٹ میں مراسلہ چھاپنا پڑا کہ تعلیمی کانفرنس میں شریک ہونا ممنوع نہیں، ہم کو معلوم ہے کہ بہت سے معزز لوگوں نے مسلم لیگ کی ممبری کے لیے یہ شرط پیش کی صاحب کلکٹر بہادر سے اجازت دلوائی جائے۔

جب ہم اس اختلاف حالت کا سبب پوچھتے ہیں تو ہمارے لیڈر یہ نازک فرق سمجھاتے ہیں کہ ہندو مچھر ہیں، اس لیے گورنمنٹ ان کی بھن بھناہٹ کی پروا نہیں کرتی لیکن مسلمان شیر نیستان ہیں، ان کے ہم ہمہ سے جنگل دہل جاتا ہے، خیر اب یہ فریب کاری ختم ہوچکی ہے۔ (ایضاً ص ۱۳ تا ۱۴)

علامہ شبلی نے جس زور وشور سے کانگریس میں مسلمانوں کو شامل ہونے پر آمادہ کیا اور کھل کر مسلم لیگ کی مخالفت کی اور مسلم لیگ کے خلاف نظمیں لکھیں، وہ ان کے مشہور مقالہ "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" سے ظاہر ہے، اسی طرح جو سیاسی نظمیں علامہ شبلی نے مسلم لیگ کے خلاف لکھیں وہ "الہلال" میں شائع ہوئیں، عجیب امر یہ ہے کہ لوگ تصور رکھتے ہیں کہ علمائے دیوبند نے کانگریس کا ساتھ دیا مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ طبقۂ علما میں مولانا شبلی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت کی کھل کر دعوت دی اور اس دور کی خوشامد پسند اور انگریز نواز، مسلم لیگ پر خوب حملے کیے، ذرا "کلیات شبلی" کے اوراق اٹھا کر دیکھیے اور "الہلال"

کی فائل میں مولانا شبلی کی طنزیہ سیاسی نظمیں مسلم لیگ کے خلاف پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ علامہ شبلی سیاسی طور پر کتنے بالغ نظر اور ژرف نگاہی کے حامل تھے کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد، قومی جدوجہد اور آزادی کی راہ کو اپنایا اور اسی رنگ میں مولانا ابوالکلام آزاد کو رنگ دیا۔

الہلال علامہ شبلی کا صور تھا جس نے پورے ملک میں ہلچل مچادیا، مسلمانوں کو پوری طاقت سے پکارا اور جدوجہد آزادی میں شرکت کی دعوت دی، الہلال کا فارم درحقیقت دبستان شبلی کا محاذ جنگ تھا، جس میں گہری اسلامیت، عالم اسلامی کا درد، پان اسلامزم، کانگریس کی طرف دعوت اور مسلم لیگ کی مخالفت، یہ سب علامہ شبلی کی آواز بازگشت کا نتیجہ تھا، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ جب قائم ہوئی تھی تو اس کا مقصد گورنمنٹ کے بجائے ہم وطنوں سے لڑنا اور حکومت وقت سے اظہار وفاداری کرنا تھا، اسی لیے اس وقت اس کے ممتاز ارکان عہدہ داروں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خطاب یافتہ امرا اور ارباب جاہ تھے لیکن دفعتاً جنگ طرابلس، بلقان اور معرکۂ مسجد کان پور کے زمانہ میں حکومت برطانیہ کے طرز سیاست کو دیکھ کر یکے بعد دیگرے مخالفانہ جذبات اور ہیجانات پیدا ہوتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرجوش مسلمان جو احرار شمار کیے گئے لیگ سے نفرت کرنے لگے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے اور احرار مسلمان تمام تر کانگریس میں شامل ہوگئے، اس تحریک کے ابھارنے میں اور احرار کی رہنمائی میں مرحوم مصنف کا بڑا حصہ ہے اور اس کی نظمیں اس تحریک وانقلاب کا بڑا ذریعہ ہیں"۔ (کلیات شبلی، ص ۶۱)

اس طرح جب الہلال کلکتہ سے طلوع ہوا اور بہت جلد افق صحافت پر بدر کامل بن کر چمکا تو وہ سب علامہ شبلی کے تربیت یافتہ نوجوانوں اور ادیبوں کا کرشمہ تھا جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا عبداللہ عمادی جیسے صاحب نظر، اہل قلم وفکر اس کی ادارت کے بورڈ میں شامل تھے، دبستان شبلی کے اہم ارکان سے اس کی بزم آراستہ تھی، یہ سب مولانا ابوالکلام آزاد کے پرجوش عربی آمیز اسلوب میں لکھتے تھے مگر تھے سب مولانا شبلی کے صحبت یافتہ اور تربیت یافتہ، پھر مولانا شبلی خود بھی اس میں اپنی نظمیں بھیجتے تھے، اس بنا پر الہلال کی آواز علامہ شبلی کی آواز تھی جو پورے ملک میں پھیل گئی اور اس نے کانگریس میں شمولیت کا صور پھونکا، ادھر مولانا شبلی اپنی نظموں

سے مسلم لیگ پر ضرب لگاتے رہے۔

اس طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا سیاسی نظریہ درحقیقت علامہ شبلی کے اثرات کا نتیجہ ہے، مولانا آزاد نے جو خطبہ علی گڑھ میں دیا ہے اس میں صاف الفاظ میں سرسید کی عظمت کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سرسید کی کانگریس کی مخالفت صحیح موقف نہ تھا۔ (دیکھیے آج کل کا آزاد نمبر)

مولانا آزاد علامہ شبلی کے وفادار تربیت یافتہ اور معتقد تھے، چنانچہ جب بھی مولانا شبلی پر مخالفین نے حملے کیے، مولانا آزاد نے "الہلال" میں ان کے خلاف زبردست محاذ آرائی کی، جب ندوہ کے متقشف اور روایت پرست حلقہ نے علامہ شبلی پر حملہ کیا اور ندوہ سے ان کو نکالنا چاہا تو خود مولانا ابوالکلام آزاد نے مقالات لکھنے شروع کیے، پہلے تین مقالے علامہ شبلی کی مدافعت میں لکھے، پھر طویل سلسلۂ مقالات شروع کیا اصلاح ندوہ کے لیے، علامہ سید سلیمان ندوی نے ان واقعات کو حیات شبلی میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مولوی عبدالکریم کی معطلی کا معاملہ: علامہ شبلی نے الندوہ کی اڈیٹری سے استعفادے دیا تو مولوی عبدالکریم صاحب کو الندوہ کا اڈیٹر مقرر کیا گیا، اس وقت جنگ طرابلس وجنگ بلقان جاری تھی، اس مناسبت سے مولوی عبدالکریم نے جہاد کی فضیلت پر ایک طویل مقالہ لکھ کر شائع کیا، علامہ شبلی اور دوسرے اہل حل وعقد نے ایک جلسہ کر کے مولوی صاحب کو چند دن کے لیے معطل کردیا مگر مجلس انتظامیہ نے مولوی صاحب کو بری کردیا لیکن جب منشی احتشام علی صاحب کمشنر صاحب سے ملے تو اس نے اصرار کیا کہ مولوی صاحب کو سزا دی جائے، چنانچہ ان کو چھ ماہ کے لیے معطل کردیا گیا۔ (حیات شبلی، ص ۶۴۵-۶۵۰)

اس موقع پر مولانا آزاد نے ایک مقالہ تین قسطوں میں الہلال میں شائع کیا اور علامہ شبلی کی موافقت اور ندوہ کے قدامت پرستوں کی مخالفت کھل کر کی، اس مقالہ کا عنوان ہے "شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اور مسئلۂ ندوہ"، اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر مولانا آزاد نے نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے (دیکھیے الہلال، ۳۰/اپریل ۱۹۱۳ء، ۲۳/اپریل ۱۹۱۳ء اور ۷/مئی ۱۹۱۳ء)، انہیں بحثوں میں مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "مولانا شبلی ندوہ کی ازسرنو زندگی کا باعث ہوئے اور

گورنمنٹ کی بدگمانی کو دور کرایا"۔ (۲۳/ اپریل ۱۹۱۳ء)

مولانا شبلی کا ندوہ سے استعفا اور طلبہ کی اسٹرائک: اگر چہ حیات شبلی میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے (دیکھیے ص ۶۵۰ اور ۶۵۱) مگر اصل صورت حال اور مفصل مقالات الہلال میں موجود ہیں۔

الہلال اور مولانا ابوالکلام: علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاح کا صور جس نے پھونکا وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا، انہوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور و شور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک آگ لگ گئی اور ہر طرف ندوہ، ندوہ کا شور برپا ہو گیا۔ (حیات شبلی، ص ۶۵۸)

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ اصلاح ندوہ کے لیے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ۵۰ جلسے منعقد ہوئے۔ (حیات شبلی، ص ۶۵۷)

اب مولانا آزاد نے علامہ کی حمایت میں ایک زبردست مقالہ قسط وار لکھنا شروع کیا جو اداریے کی جگہ شائع ہوتا تھا، اس کا عنوان تھا "مسئلہ بقاو اصلاح ندوۃ العلما"۔

الہلال ۱۸/ مارچ ۱۹۱۳ء میں صفحہ ۲۲۰ پر دار العلوم ندوۃ العلما (طلبہ کی اسٹرائک) پر خبر چھپی، اسی پرچہ میں ندوۃ العلما اور علامہ شبلی نعمانی پر تبصرہ ہے، اسی پرچہ میں الہلال کا یہ نوٹ ہے:

"اب ندوہ کا معاملہ صرف مولانا شبلی کی معتمدی کا مسئلہ نہیں رہا، سوال بعد کا ہے کہ آئندہ کون ہو؟ بہت پہلے ندوہ کے تمام معاملات کی اصلاح کرنی چاہیے اور قوم کے مثل تمام کاموں کے اس کام کو بھی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہیے"۔ (الہلال، ۱۸/ مارچ ۱۹۱۳ء)

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے اصلاح ندوہ کی آواز بلند کی اور اس زور و شور سے کی کہ سارے ملک میں زلزلہ آ گیا، مولانا آزاد نے ایک مقالہ "مسئلہ بقاو اصلاح ندوۃ العلما" کے نام سے لکھنا شروع کر دیا، وہ نامہ نگاروں کی رپورٹیں شائع کرنے لگے، اس مقالہ کی مندرجہ ذیل قسطیں الہلال میں شائع ہوئیں:

۱- مسئلہ بقاو اصلاح ندوۃ العلما، ۲۵/ مارچ ۱۹۱۳ء۔

۲- شریعت اور علمائے ندوہ، ۸/ اپریل ۱۹۱۳ء۔

۳- ندوۃ العلما ماضی و حال، ۲۵/ اپریل ۱۹۱۳ء۔

۴- مولود فساد کا کامل فروغ مزعومہ و مفروضہ نظامت ندوۃ العلما، ۱۷/ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۲۷۹ تا ۲۸۲۔

۵- ندوۃ العلما کی قسمت کا فیصلہ۔

۶- مدارس عربیہ: نو مولود فساد، ۲۳/ اپریل ۱۹۱۳ء۔

۷- مسئلہ بقاو اصلاح ندوہ، ۲۹/ اپریل ۱۹۱۳ء، ص ۲۲۸۔

۸- مولانا آزاد کی کوشش سے دہلی میں ۱۰/ مئی ۱۹۱۳ء کو اصلاح کمیٹی کا جلسہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے گھر پر منعقد ہوا، مگر جون تک کے پرچے میں برابر اصلاح ندوہ پر مقالے شائع ہوتے رہے، ۷/ مئی ۱۹۱۳ء کے پرچہ میں بھی مقالے ہیں۔

۹- مسئلہ بقا اور اصلاح ندوہ، ۱۳/ مئی ۱۹۱۳ء۔

۱۰- مسئلہ بقاو اصلاح ندوہ، ۲۷/ مئی ۱۹۱۳ء۔

۱۱- مسئلہ بقاو اصلاح ندوہ، ۱۰/ جون ۱۹۱۳ء۔

۱۲- الاسبوعہ، شذرات ندوہ پر، ۱۷/ جون ۱۹۱۴ء۔

مولانا آزاد نے مارچ، اپریل، مئی اور جون ۱۹۱۳ء تک جو مقالات، رپورٹیں، شذرات اور مراسلات علامہ شبلی اور ندوۃ العلما کے متعلق شائع کیے ہیں وہ ایک ضخیم کتاب بن سکتے ہیں، ان مباحث میں ندوہ کی تاریخ اور مقاصد مکمل طور سے بیان کیے گئے ہیں، یہ مولانا کا قلم گہر بار تھا جس کی وجہ سے اصلاح ندوہ کی تحریک کامیاب ہوئی، علامہ شبلی کے شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی ندوہ میں عزت کے ساتھ داخل ہوئے اور تمام مسائل حل ہو گئے مگر پھر ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کے انتقال کے بعد سارے مسائل ختم ہو گئے اور مولانا شبلی کے اصل مخالف مولانا خلیل الرحمٰن صاحب ندوہ چھوڑ کر اپنے وطن چلے گئے۔

اگر مولانا آزاد کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو ندوہ کے مقاصد، تاریخ اور لائحہ عمل کا عمدہ نقشہ ہمارے سامنے آ سکتا ہے، مولانا آزاد نے یہ سب علامہ شبلی کی محبت و تعلق سے کیا ورنہ ندوہ

ندوہ کے طالب علم کبھی نہیں رہے، وہ علامہ شبلی کی محبت میں ندوہ سے بھی محبت کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"ندوہ ایک ایسی تعلیم گاہ ہے جو اپنی تعلیمی خصوصیتوں کے لحاظ سے دوسری تعلیم گاہوں سے امتیاز رکھتی ہے، اس کا اصل مقصد یہ تھا اور ہے کہ جو علما فارغ التحصیل ہوکر نکلیں وہ اپنے علوم میں ماہر ہونے کے علاوہ دوسری زبانوں سے بھی (جیسے کہ انگریزی زبان ہے) کسی قدر آشنا ہوں تاکہ ایک طرف وہ اشاعت اسلام جیسے مقدس و مہتم بالشان فرض کو ادا کرسکیں اور دوسری طرف وہ ان غیر مذہب والوں کے حملوں سے واقف ہوتے اور ان کے جوابات دیتے رہیں جو اپنا فرض سمجھ رہے ہیں کہ اسلام کو دنیا کی نظروں میں کم زور اور ضعیف مذہب ثابت کریں، ندوہ کا یہی وہ اعلا اور اہم فرض تھا جس نے مسلمانوں کو بہت جلد اپنی طرف کھینچ لیا اور ندوہ کا بھی وہی نصب العین تھا جس نے اس کو اسلامی مدارس میں ممتاز بنادیا"۔ (مقالہ "مدارس اسلامیہ"، ۲۲/جون ۱۹۱۴ء)

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط سید الطائفہ کے نام

مولانا سید سلیمان ندوہ اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں نے علامہ شبلی کی شخصیت سے فیض اٹھایا ہے جو خطوط مولانا آزاد نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھے تھے، ان کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے "مشاہیر کے خطوط" میں شائع کردیے ہیں، یہ خطوط مولانا آزاد کی غیر معمولی دل چسپی اور دارالمصنفین سے محبت و تعلق کا اظہار کرتے ہیں، مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے خطوط پر ایک نوٹ لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"دارالمصنفین اور حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلقات بہت دیرینہ اور گوناگوں تھے، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد خاص اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان کے فیض یافتہ تھے، اس رشتہ سے دونوں خواجہ تاش تھے، دونوں کا ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، الہلال کلکتہ اور قومی کاموں میں ساتھ رہ چکا تھا، ان تعلقات و روابط کی بنا پر دونوں میں مراسلت کا سلسلہ جاری تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط

کا بڑا ذخیرہ دارالمصنفین میں موجود ہے، یہ خطوط علمی، ادبی اور تاریخی حیثیت سے نہایت اہم ہیں، یہ پہلے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے معارف میں شائع ہوئے تھے اور اب اس مجموعہ میں شائع کیے جارہے ہیں، دارالمصنفین مولانا شبلی کی یادگار ہے، اس لیے مولانا ابوالکلام کو اس سے شروع سے دل چسپی تھی، بلکہ اس کے قیام میں بھی ان کا مشورہ شریک تھا اور وہ وقتاً فوقتاً مفید مشورے بھی دیتے رہے"۔(۱)

ان خطوط سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جن سے یہ پتہ چلے گا کہ مولانا شبلی کے واسطہ سے مولانا آزاد کو حضرت سید صاحب سے کتنا خلوص اور ان کے دل میں دارالمصنفین اور خود سید صاحب کا کتنا احترام تھا، ایک خط میں مولانا آزاد حضرت سید صاحب کو لکھتے ہیں:

"میں آپ کی عزت کرتا ہوں اور خدا شاہد ہے کہ آپ میں وہ قابلیت موجود ہے کہ آپ لاکھوں نفوس کو زندگی سکھلا سکتے ہیں، آپ آکر البلاغ بالکل لے لیجیے جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجیے، اگر مولانا شبلی کا خیال ہو کہ ان کے ذریعہ پونہ تشریف لے گئے ہیں وہ مصر تھے اب ناراض ہوں گے تو میں خود ان سے اس معاملہ کو کہہ کر صاف کرلوں گا"۔ (مشاہیر کے خطوط، ص ۱۶۹-۱۷۱)

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ "البلاغ کو اپنی ایڈیٹری میں لے لیں اور خاص دینی و اصلاحی رسالہ کی شکل میں اس کو جاری رکھیں، اگر آپ ایسا کرنے کو تیار ہوں تو دارالارشاد بھی مع کتب خانہ کے آپ کے سپرد کردیا جائے"۔ (ص ۱۷۲-۱۷۳)

دارالمصنفین کے متعلق رقم طراز ہیں:

"دارالمصنفین کا پراسپکٹس پہنچا، آپ مجھے اس سلسلہ میں جو کچھ بنانا چاہیں منظور ہے، آنریری فیلو تو یہ ایک عمدہ بات ہے اگر اس میں کوئی جگہ قلمی کی ہو تو جب بھی میں منظور کرلوں گا بشرطیکہ کام ہو اور مجمع صحیح و خالص"۔ (ص ۱۷۶-۱۷۷)

دارالمصنفین کو جس قدر رنگ رکھیے گا اسی قدر وہ حقیقی اور عملی ہوگا۔

---

(۱) مشاہیر کے خطوط مولانا سید سلیمان ندوی کے نام، مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی، شبلی اکیڈمی، طبع اول ۱۹۹۲ء، ص ۱۶۸۔

دو چار آدمی اچھا کام کر سکتے ہیں لیکن مجمع جہلا بیکار ہے''۔ (ص ۱۷۹)

''معارف کے متعلق یہ آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی ایک پرچہ ہے اور ہر طرف سناٹا ہے، الحمد للہ کہ مولانا شبلی کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی یہ دولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو صرف تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہے''۔ (ص ۱۷۹)

ان عمدہ تبصروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے معنوی استاذ علامہ شبلی کے قائم کردہ دارالمصنفین سے کتنا متاثر تھے، اسی بنا پر جب اس کی مالی حالت تقسیم ہند کے باعث خراب ہوگئی تو اپنی وزارت تعلیم سے اسے ۶۰ ہزار روپے دلایا۔

مکاتیب شبلی کے آئینے میں علامہ شبلی نے جو چالیس خط مولانا ابوالکلام آزاد کو لکھے ہیں وہ بھی مولانا کے گہرے دلی تعلق پر دال ہیں:

''بھائی تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کردی کہ الیأس احدی الراحتین لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکہ لگا دیتے ہو خیر جو مرضی، یہ بھی منظور، کلکتہ گیا، ایک خاص کام تھا مولوی شریف الدین کے یہاں ٹھہرا، دل چسپیوں کی نئی راہیں نکلیں''۔ (مکاتیب شبلی، ص ۲۶۳-۲۶۴)

''آپ کو اب زیادہ مولویت کی صورت میں رہنا چاہیے، اس سے بہت اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں''۔ (ص ۲۷۱)

''سب پر مستزاد الحاد و زندقہ، جن عقائد کا مجھ سے اقرار لیا جائے گا، ان میں کرامات الاولیا حق، حالاں کہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں، ہاں! ان ہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے، بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا، کہاں تک صبر کروں''۔ (ص ۲۷۵)

مولانا آزاد کی زبان پر مولانا شبلی فرماتے ہیں:

''آپ کی سخن سرائی پر بار بار ٹوکنے کو جی چاہتا تھا کہ مرض میں اضافہ ہو رہا ہے لیکن اس قدر گستاخی نہ ہوسکی، بہر حال کچھ دن زبان سعدی در کام رہنی

چاہیے''۔ (ص ۲۸۳)

علامہ شبلی کا تبصرہ زبردست ہے، مولانا آزاد کی زبان کو سخن سرائی کہنا زبان سعدی لکھنے کا مشورہ دینا خوب تر ہے:

''میری جدید نظمیں علی گڑھ والے چھاپ رہے ہیں، کشافیات پر بھی ان کی نظر ہے لیکن اس کا سلسلہ اگر ہوگا تو الگ ہوگا''۔

مولانا سید سلیمان ندوی اس پر نوٹ لکھتے ہیں کہ ''الہلال میں بعض نظمیں کشاف کے فرضی نام سے مولانا نے لکھی تھیں، کشافیات سے یہ نظمیں مراد ہیں''۔ (ص ۲۸۴)

''ندوہ کا قصہ اب ٹالنے کی چیز نہیں...... الہلال وغیرہ نے احساس عام پیدا کردیا ہے یعنی تمام اسلامی کاموں پر لوگوں کو مداخلت کا دعوا پیدا ہوگیا ہے، اسی اصول پر الہلال میں یہ صدا بلند ہونی چاہیے''۔ (ص ۲۸۸)

''اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا ورنہ سب کارروائی بیکار ہو جائے گی، سید سلیمان اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا''۔ (ص ۲۸۹)

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ یہ مولانا شبلی کا سب سے آخری پیغام وفات سے چار دن پہلے تار کے ذریعہ بھیجا گیا۔ (ص ۲۸۹)

حضرت سید صاحب اپنے قلب کے تقاضے سے وفات سے ذرا پہلے پہنچ گئے تھے مگر مولانا آزاد اور مولانا حمید الدین فراہی نہ پہنچ سکے۔

ان خطوط سے طرفین کے علمی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کو ان سے کتنا تعلق تھا اور خود مولانا آزاد کو بھی کتنا تعلق حضرت علامہ سے تھا کہ تین ماہ تک مسلسل ان کے محاسن و محامد پر لکھتے رہے اور سارے ملک کو اصلاح ندوہ پر آمادہ کردیا۔

مکاتیب شبلی، مشاہیر کے خطوط، حیات شبلی اور الہلال کے صفحات شہادت دیتے ہیں کہ علامہ شبلی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو علمی کاموں کے لیے تیار کیا تھا، ان کی رہنمائی اور تربیت کی تھی، الہلال اور مسلم گزٹ نظریات شبلی کے ترجمان تھے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے، علامہ شبلی اور

دبستان شبلی نے ملک کی آزادی اور مسلمانوں کے اندر روح حریت پیدا کرنے کا عظیم کام انجام دیا اور اسی وجہ سے احرار کا ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور ملک میں جو عظیم جدوجہد آزادی کی جاری تھی اس میں مولانا نے صور پھونک دیا، ایک طرف الہلال تھا اور دوسری طرف ہمدرد تھا، آزاد اور محمد علی دونوں علامہ شبلی کے تربیت یافتہ تھے اور دونوں نے آزادی، حریت، قربانی اور انگریزی استبداد کے خلاف عظیم جدوجہد سے ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ایک اعلا مقام پیدا کرلیا اور ہندوستان کی جدید تاریخ میں مسلمانوں کا سر بلند کردیا۔

"نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں"

مآخذ و مراجع

مکاتیب شبلی حصہ اول، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، طبع چہارم ۱۹۶۶ء، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔

کلیات شبلی (اردو)، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ۱۹۲۵ء، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

حیات شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، ۱۹۹۹ء، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

مقالات شبلی (جلد ہشتم) از علامہ شبلی نعمانی، طبع جدید ۲۰۰۰ء، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، طبع اول، ۱۹۹۲ء، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ۔

ہفتہ وار کلکتہ کے مندرجہ ذیل شمارے:

الہلال ۱۸؍مارچ ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۲۵؍مارچ ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۸؍اپریل ۱۹۱۳ء۔

الہلال ۲۳؍اپریل ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۲۹؍اپریل ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۷؍مئی ۱۹۱۳ء۔

الہلال ۱۳؍مئی ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۲۷؍مئی ۱۹۱۳ء۔ الہلال ۱۰؍جون ۱۹۱۳ء۔

الہلال ۱۷؍جون ۱۹۱۳ء۔

اورنگ زیب کے عہد میں تعلیم کی ترویج و اشاعت

از:- ڈاکٹر علاء الدین خاں اصلاحی☆

ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور اس کو قوت و استحکام عطا کرنے میں مسلمانوں کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، ان کا یہ بھی امتیاز ہے کہ انہوں نے یہاں آکر علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد کردیا، ہندوستان کے مسلمان فرماں روا علم دوست اور علم پرور تھے، ان کے درباروں میں علما اور اہل کمال کا مجمع لگا رہتا تھا، ان کے زمانے میں جو مدارس یہاں قائم ہوئے، ان میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے، یہ درس گاہیں حکومت کے تعاون سے اور اس کے تعاون کے بغیر بھی چلتی تھیں، اس طرح مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ان کی زندگی کا جزء لاینفک ہوگئے تھے۔

سندھ اور ملتان ہندوستان میں اسلامی علوم کے اولین گہوارے تھے، غزنویوں کے قبضے کے بعد ہی لاہور علوم اسلامیہ کا مرکز بن گیا تھا، ۱۲۰۶ء میں ترکوں نے جب دہلی کو فتح کیا تو رفتہ رفتہ دور دراز کے ممتاز علما و فضلا یہاں جمع ہونے لگے اور وہ اس کے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ہر طرف پھیل گئے، اس طرح چودہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان میں ایسی علمی و تہذیبی رونق دیکھنے میں آئی جس کی نظیر اس وقت کی مسلم دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت ناصر الدین قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے لیے ملتان میں بنوائی تھی، اسی میں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی نے تعلیم پائی تھی (۱)، مسلمان ہمیشہ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کو اپنا مذہبی فریضہ اور کار خیر سمجھتے رہے ہیں، وہ طلبا کی امداد اور تعلیم کی اشاعت، مدارس کی بنا و تاسیس میں بے دریغ دولت صرف کرتے رہے ہیں، مرأۃ احمدی میں اکبر کے ایک فرمان کا ذکر ہے جو تمام صوبوں کے لیے

☆ لکچرر شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ۔

جاری کیا گیا تھا، اس میں تاکید کی گئی تھی کہ" جہاں تک ممکن ہو علم وہنر کی اشاعت ہوتی رہے تاکہ اہل کمال دنیا سے معدوم نہ ہوجائیں اور ان کی یادگاریں صفحۂ ہستی پر باقی رہیں" (۲)، دلی سلطنت میں متعدد مدارس قائم کیے گئے جن میں مدرسۂ معزی، مدرسۂ ناصریہ، مدرسۂ حوض خاص اور مدرسۂ فیروز شاہی قابل ذکر ہیں، آخر الذکر دلی کا سب سے بڑا اور اپنے عہد کا بہترین مدرسہ تھا، ہمایوں نے بھی علوم وفنون کی ترقی میں دلچسپی لی، علم ہیئت اور جغرافیہ سے اسے خاص لگاؤ تھا، اس نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کے ایک مدرس شیخ حسین تھے (۳)، یہ مدرسہ ہمایوں کے مقبرہ کے پاس تھا جس کی شکستہ عمارتیں ابھی تک باقی ہیں، اس مدرسہ میں اساتذۂ وقت تعلیم دیتے تھے اور مقبرہ کے پہلو میں چھوٹے چھوٹے کمرے طلبا کی اقامت کے لیے بنے ہوئے تھے (۴)، اکبر نے بھی تعلیم کی ترویج واشاعت کے لیے متعدد مدارس قائم کیے، آگرہ میں ایک مدرسہ تھا جس میں شیراز کے ایک عالم جلبی بیگ کو درس وتدریس کے لیے مقرر کیا تھا، فتح پور سیکری میں مسجد اور خانقاہ کے ساتھ ایک مدرسہ بھی تھا (۵)، عہد اکبری میں ماہم بیگ نے پرانے قلعہ کے پاس مغربی دروازے کے مقابل میں ایک مسجد اور مدرسہ بنوایا جس کا نام خیر المنازل تھا (۶)، ابوالفضل نے بھی فتح پور سیکری میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، عبدالرحیم خان خاناں کے مدارس مختلف مقامات پر تھے، مسجدوں اور خانقاہیں بھی درس گاہ کا کام دیتی تھیں جن میں اس شہر اور گاؤں کے صوفیا وعلما درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور شاہی دربار سے ان کی اعانت برابر ہوتی رہتی تھی، ابوالفضل کے مطابق اس زمانے میں اخلاق، حساب، ہندسہ، نجوم، فلاحت، سیاحت، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی وغیرہ علوم پڑھائے جاتے تھے (۷)، جہاں گیر بھی اپنے آباء واجداد کی طرح علم کا اچھا ذوق رکھتا تھا، اس نے مدارس کی تعمیر کا یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ جب کوئی امیر یا متمول مسافر لاوارث ہوجاتا تو اس کے مال ومتاع سے مدارس اور مساجد تعمیر کراتا تھا (۸)، ویران مدارس کو از سرنو آباد کرنا بھی اس کا کارنامہ ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخیار" میں اس مدرسہ کا ذکر کیا ہے جہاں انہوں نے تعلیم پائی تھی، اس کے تعلیمی اوقات صبح سے دوپہر تک اور پھر ظہر بعد سے شام تک ہوتے تھے۔ (۹)

شاہ جہاں نے اکبر و جہاں گیر کے عہد کے مدارس کو نہ صرف بدستور قائم رکھا بلکہ انہیں

مزید فروغ دینے کی کوشش بھی کی، اس کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے جوار میں دار البقاء نامی مدرسہ قائم کیا جن میں طلبا معقول ومنقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے (۱۰)، طلبا کے داخلے میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا، مدارس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے رہتے تھے، اس زمانے کے صوفیا نے بھی جہل کی تیرگی مٹانے اور علم کی اشاعت پر پورا زور دیا، اس وقت درس وتعلیم کا معاوضہ لینے کا کوئی رواج نہیں تھا، بعض علما فقر وفاقہ کی زندگی گزارتے لیکن مفت تعلیم دیتے، شیخ نظام الدین اولیا کے استاد مولانا علاء الدین اصولیؒ کے پاس بعض اوقات کھانے کے لیے صرف تل کی کھلی (کنجارہ) رہتی لیکن ایسی حالت میں بھی وہ کسی سے کچھ قبول نہ کرتے۔ (۱۱)

اورنگ زیب ایک وسیع النظر بادشاہ تھا، اس کو بھی علم کے فروغ اور تعلیم کی اشاعت سے دلچسپی تھی، اسے زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے شغف رہا، امور سلطنت کی گوناگوں مشغولیتوں میں بھی وہ فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کے لیے وقت نکال لیتا تھا، اس کی تعلیم لائق اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی تھی، اپنے ایک استاذ مولانا عبداللطیف کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ میرے تمام استادوں میں ان کا حق زیادہ ہے کیوں کہ وہ میری تعلیم میں کسی قسم کی مداہنت اور تساہل کو راہ نہ دیتے تھے (۱۲)، اورنگ زیب کو دینی علوم سے فطری رغبت تھی، لائق اور فاضل اساتذہ کی رہنمائی سے اس کا یہ ذوق اور زیادہ سوا ہوگیا تھا، مآثر عالم گیری میں ہے کہ:

> "قبلۂ عالم کے کمالات کسبیہ کا عظیم الشان کارنامہ علوم دینیہ یعنی فقہ اور تفسیر وحدیث کی تحصیل ہے، جہاں پناہ کو حضرت امام غزالیؒ کی تصنیفات اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے منظومات اور شیخ زین الدین وقطب الدین، محی الدین شیرازی کے رسائل سے خاص شوق تھا اور یہ کتابیں اکثر مطالعہ میں رہتی تھیں"۔ (۱۳)

اورنگ زیب کو وحید عصر مولانا سید محمد قنوجی کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا، شاہان مغلیہ میں اس سے پہلے کسی شاہ زادے کو کلام مجید کے حفظ کی سعادت نصیب نہیں ہوئی، اس نے سلوک وطریقت کی بھی تعلیم پائی، وہ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا، ان کا صاحب زادہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی سے عقیدت رکھتا تھا، ذیل میں علم وفن کی ترویج واشاعت میں اس کی مساعی کا تذکرہ کیا جاتا ہے، عالم گیر نامہ کا مصنف رقم طراز ہے:

''چوں کہ اعلا حضرت کو علم و فضل کی اشاعت و ترویج کا بے حد شوق ہے، اس لیے اس وسیع ملک کے تمام شہروں اور قصبات میں فضلا اور مدرسین کو مناسب وظیفے، روزینے اور املاک عطا فرما کر علوم کی تعلیم و تدریس میں مشغول فرما رکھا ہے اور طالبان علم کے لیے ہر علاقہ میں ان کے حالات و رتبہ اور استعداد کے مطابق وجوہ معیشت مقرر کردیے ہیں، ہر سال اس پر کثیر رقم صرف ہوتی ہے اور شاہی فیاضی اور سخاوت سے طالبان علم و کمال کی تعداد بڑھ گئی ہے اور وہ اطمینان کے ساتھ علوم و فنون حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں جن کی دعاؤں کی برکت ان کی پُرشکوہ حکومت کی بقا کی ضامن بنی ہوئی ہیں''۔(۱۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے عہد عالم گیری میں حکومت کی زیر سرپرستی تعلیمی کوششوں کے کئی گوشے روشن ہوجاتے ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ عالم گیر نے تمام شہروں اور قصبوں کے مدارس اور ان میں درس کی خدمت پر مامور اہل علم کو وظیفے دیے تاکہ یہ لوگ یک سوئی اور دلجمعی سے اس خدمت کو انجام دیں، اسی طرح طالب علموں کے لیے بھی معاش کا انتظام کیا گیا تھا، گویہ نظام وسیع پیمانے پر کیا گیا تھا تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی بہ دولت ان شہروں اور قصبوں کی کس قدر آبادی تعلیم سے بہرہ ور ہوئی، ان سرکاری مکاتب اور مدارس کے علاوہ جن کا سارا خرچ حکومت خود چلاتی تھی بڑی تعداد ان مدارس کی بھی تھی جن کا نظم و نسق صوبائی حکومتوں کے ذمہ تھا، اورنگ زیب نے ان پر یہ فرض عائد کیا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں تعلیم کی طرف توجہ دیں، گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے اور وہاں کے طلبا کو جو سہولتیں بہم پہنچائی گئیں اس کا حال مرأۃ احمدی میں اس طرح درج ہے:

''مکرمت خان دیوان صوبہ کے نام حکم جاری ہوا، چوں کہ ممالک محروسہ کے تمام صوبوں میں یہ مقدس اور بلند فرمان نافذ ہوچکا ہے کہ ہر صوبہ میں مدرسین مقرر کیے جائیں اور میزان سے لے کر کشاف تک کے طالب علموں کو صدر صوبہ کے استصواب رائے سے اور مدرسوں کی تصدیق کو دیکھ کر اس صوبے کے خزانچی کی تحویل سے وجہ معاش دی جائے، اس لیے اس وقت احمد آباد، پٹن اور سورت میں تین مدرسین کا اور صوبۂ احمد آباد میں ۴۵ طالبان علم کا اضافہ کیا گیا''۔(۱۵)

اورنگ زیب طلبا کی مدد ان کی اہلیت کے لحاظ سے کرتا تھا مثلاً میزان پڑھنے والوں کو ایک آنہ یومیہ، منشعب پڑھنے والوں کو دو آنہ اور شرح وقایہ اور فقہ کے طالب علموں کو آٹھ آنہ یومیہ ملتے تھے (۱۶)، بادشاہ نے بوہروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے خاص طور پر انتظام کیا، ان کے لیے مدرس مقرر کیے گئے اور امتحانات کا سلسلہ جاری کیا گیا، عالم گیر کی دل چسپی کا یہ حال تھا کہ امتحانات کے نتائج خود اس کے ملاحظے کے لیے بھیجے جاتے تے (۱۷)، سرکاری مدارس کے علاوہ انفرادی کوشش کے نتیجہ میں جو ادارے وجود میں آئے تھے، ان کی بھی عالم گیر بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا، ۱۶۷۸ء میں گجرات کے مدرسوں کی مرمت کے لیے اس نے ایک خاص رقم منظور کی (۱۸)، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۱۶۹۷ء میں اکرام الدین خاں صدر کے مدرسے کے لیے سوندرہ ''پرگنہ سانولی'' اور سیہہ ''پرگنہ کڑی'' گاؤں وقف کیے، اس طرح مدرسہ سیف خاں کو ایک مرتبہ ۱۵۸۰ روپیہ بھجوایا۔

عالم گیر کے عہد میں دو طرح کے مدرسے قائم تھے، ایک وہ جن کے پورے مصارف حکومت کی طرف سے ادا ہوتے تھے اور جن کا انتظام اور انصرام بھی اسی سے متعلق تھا، یہ شاہی مدرسے تھے دوسرے وہ مدرسے جو ارباب خیر اور علمائے دین کی کوششوں سے چل رہے تھے، عالم گیر نے پہلے قسم کے مدرسوں کے لیے ہر صوبہ میں یہ انتظام کردیا تھا کہ مدرسین کی تنخواہیں اور طالب علموں کے وظائف اسی صوبے کے خزانے سے ادا کیے جائیں اور صوبہ دار مدرسین سے تنخواہوں کی وصولی سیاہہ حاصل کر کے خزانہ میں داخل کرلیا کرتا اور غیر سرکاری مدرسوں کو وقتاً فوقتاً خزانہ سے امداد دیا کرتا تھا، عالم گیر کی قدر شناسی، علم پروری نیز اس کی توجہ سے پورب کا علاقہ خانقاہوں اور مدرسوں سے معمور تھا، شہر شہر قریہ قریہ میں علما اور فضلا بڑے سکون سے اپنے کاموں میں مشغول تھے، خصوصاً جون پور اور اس کے اطراف میں اس وقت مدارس کا بڑا مرکز تھے، مولوی خیر الدین محمد جون پوری لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب عالم گیر باعمل اور عامل باعلم تھے، شاہ زادگی ہی کے

زمانے سے علما کی زیادہ سے زیادہ قدر دانی کرتے تھے یہاں تک کہ اس زمانہ میں جون پور سلاطین شرقیہ کے دور کے مانند ہوگیا اور علما و مشائخ کی کثرت اور طالبان علوم و فیوض کے انبوہ سے رونق پیدا ہوگئی اور جب تخت سلطنت پر رونق افروز ہوئے تو ناظم جون پور کے نام خصوصی حکم نامہ جاری کیا تا کہ وہ یہاں کے اساتذہ اور مشائخ کے حالات لکھ کر روانہ کرے نیز وقائع نویسوں کو سخت تاکید کی تا کہ وہ اس طبقے کی معاش و معیشت کی خبر گیری کریں، الغرض عہد عالم گیری میں جون پور گلزار ارم بن گیا اور اس کے اطراف و جوانب کے شہر و قصبات میں قدیم مدارس کی ترقی کے ساتھ نئے مدارس اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں''۔ (۱۹)

عہد عالم گیری میں دیار پورب میں سیکڑوں علما و مشائخ اپنے اپنے حلقوں میں کام کررہے تھے، اس عہد کے مدرسین میں حافظ امان اللہ بنارسی، قاضی محب اللہ بہاری، ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا جیون امیٹھوی، سید سعد اللہ سلونی، قاضی عصمت اللہ لکھنوی، شیخ غلام محمد لکھنوی اور شیخ غلام نقش بند گھوسوی وغیرہ جیسے کبار علما جو ہم عصر تھے اور جن کی تعلیمی و تدریسی سرگرمی سے پورا دیار پورب دار العلم بنا ہوا تھا، ان میں حضرت شیخ غلام نقش بند گھوسوی اپنے تدریسی و تعلیمی کارناموں کی وجہ سے ممتاز شخصیت کے مالک تھے، انہوں نے گھوسی سے لکھنؤ جا کر اپنا فیض جاری رکھا، شیخ صاحب اپنے تدریسی و تعلیمی فیوض و برکات کی وجہ سے اپنے معاصرین میں خاص مقام و مرتبہ کے مالک تھے ان کے تلامذہ خصوصاً ملا نظام الدین کے ذریعہ آج بھی پورے ہندوستان میں ان کا تعلیمی و تدریسی فیض جاری ہے (۲۰)، عہد عالم گیری کی دو عظیم درس گاہیں خاصی اہمیت رکھتی ہیں، مدرسہ رحیمیہ اور مدرسہ فرنگی محل۔

۱- مدرسہ رحیمیہ اس کی بنیاد حضرت شاہ ولی اللہؒ کے والد حضرت شاہ عبد الرحیمؒ نے رکھی، یہ ۱۶۴۴ء میں پیدا ہوئے، پہلے گھر پر تعلیم پائی پھر آگرے میں میر محمد زاہد ہروی سے معقولات اور علم کلام کی کتابیں پڑھیں، تعلیم مکمل کر چکے تو دہلی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کر کے وہاں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، شاہ عبد الرحیم کا شمار اپنے زمانے کے ان اہل دل علما میں ہوتا تھا جو درباری علما سے الگ تھلگ رہے (۲۱)، شاہ عبد الرحیم کے درس میں فقہ و تصوف، کلام و فلسفہ کے علاوہ

قال اللہ و قال الرسول کی آواز بھی جو ہندوستان میں ابھی بہت عام نہیں ہوئی تھی سنائی دیتی تھی، اسی درس گاہ سے ان کے مشہور عالم بیٹے شاہ ولی اللہؒ نے تعلیم پائی اور پھر وہیں درس دیا اور شاہ عبد العزیزؒ نے بھی یہیں تعلیم حاصل کی اور یہیں درس بھی دیتے رہے، یہی وہ مدرسہ تھا جس میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی، شاہ اسماعیل، شاہ اسحاق اور شاہ عبد القادر وغیرہ کی تعلیم ہوئی تھی اور یہی وہ سرچشمہ فیض ہے جہاں سے حدیث نبوی کی برکات تمام گوشہ ہائے ہند میں پھیلیں، اس مدرسہ کی یادگار ابھی بھی دلی میں باقی ہے (۲۲)، شاہ عبد الرحیم کو وہ شہرت نصیب نہیں ہوئی جو ان کے نامور فرزند کے حصے میں آئی اور فی الحقیقت علمی و دینی خدمات میں بیٹا باپ سے گوئے سبقت لے گیا، شاہ عبد الرحیم خود بڑے سمجھ دار اور بلند پایہ عالم تھے اور شاہ ولی اللہ کی علمی ترقیوں اور طبعی نشو و نما میں ان کی تربیت اور تعلیم کو بڑا دخل تھا۔

۲- مدرسہ فرنگی محل یہ عظیم الشان مدرسہ عالم گیر کے عہد میں قائم ہوا اور اپنے وجود کے لیے اورنگ زیب عالم گیر کی سرپرستی کا ممنون ہے، ملا قطب الدین شہید سہالوی کے نامور فرزند ملا نظام الدین کے فیض نے فرنگی محل کو ہندوستان کا دار العلم والعمل بنایا، یہ اپنے والد کی شہادت کے وقت ۱۴ برس کے تھے اور شرح ملا جامی تک ان کی تعلیم ہو چکی تھی، بقیہ کتابیں ملا علی قلی جائسی، مولانا نقشبند، مولانا عبد السلام دیوی اور مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھیں، ۲۴ برس کی عمر میں مسند درس پر بیٹھے اور سہالی کا چراغ علم و فضل فرنگی محل میں روشن ہوا (۲۳)، درس نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا، ملا صاحب کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو عالم گیر نے ان سے ملاقات کی خواہش کی لیکن ملا صاحب نے گوشۂ عزلت سے نکلنا گوارا نہیں کیا (۲۴)، ملا صاحب کے حلقہ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سلسلۂ تلامذہ میں ایسے علما پیدا ہوئے جن کے الگ الگ حلقہ درس ہوگئے اور یہ تمام علما ہندوستان پر چھا گئے، ملا قطب الدین قصبہ سہالی میں رہتے تھے، جہاں انصاریوں اور عثمانیوں میں زمین داری کو لے کر کچھ جھگڑا تھا، ۱۶۹۱ء میں کچھ عثمانیوں نے ملا صاحب کو شہید کر دیا ان کے صاحب زادے ملا محمد سعید سہالوی نے عالم گیر کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انہیں معافی میں

دیا گیا (۲۵)، فرنگی محل کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلّہ میں تجارت کے تعلق سے رہتا تھا، وہ وطن چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضہ میں آگئے اور وہی اسلامی علوم کی یونی ورسٹی بن گیا (۲۶) اور اس سے ہزاروں علما فیض یاب ہو کر نکلے، ان میں مولانا عبدالعلی بحرالعلوم اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے نام علمی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔

جس طرح توسیع حدود کے لحاظ سے مغلیہ سلطنت عہد عالم گیر میں اوج کمال پر پہنچی، اسی طرح اشاعت تعلیم کے معاملہ میں بھی اس دور کو اس کا نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے، اس دور میں بہت سے مدارس قائم تھے جن کا ذکر درج ذیل ہے:

مدرسہ فیض صفا: نہروالا پٹن میں ایک مدرسہ عالیہ کی بنیاد عہد عالم گیر میں رکھی گئی جس کا نام فیض صفا تھا، اس میں ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم ہوتی تھی، اس کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی تھی اور ساتھ ہی دارالاقامہ بھی تھا، احاطہ مسجد و مدرسہ کے باہر طلبا کے غسل کے لیے قدیم طرز کا ایک حمام بھی تھا اور طلبا کو وظائف بھی ملتے تھے۔ (۲۷)

مدرسۂ شجاعت خان: عہد عالم گیر میں شجاعت خان ایک بڑا بیدار مغز گجرات کا صوبے دار تھا جس سے عالم گیر عمر بھر خوش رہا اس کے عہد میں گجرات کے لوگ بڑے خوش حال رہے اس نے اپنے مقبرہ کے ساتھ ایک عالی شان مدرسہ کی بنیاد رکھی جو اسی کے سامنے ۱۶۹۲ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، اس مدرسہ میں ہر قسم کی تعلیم ہوتی تھی، دارالاقامہ بھی تھا طلبا کے اخراجات کا بھی معقول بندوبست تھا جب یہ بندوبست ختم ہو گیا تو مدرسہ بھی بند ہو گیا۔ (۲۸)

بنارس میں مولانا امان اللہ بنارسی کی بہت مشہور درس گاہ تھی جہاں سے ملا نظام الدین نے بھی فیض حاصل کیا تھا (۲۹)، مسلم عہد حکومت میں گجرات کی علمی ترقیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں، یہاں مدارس اور تعلیم گاہیں بہ کثرت تھیں، انہیں میں سے مدرسہ ہدایت بخش یا مدرسہ شیخ الاسلام بہت مشہور ہے۔ (۳۰)

مدرسہ ہدایت بخش: محمد اکرام الدین خاں شیخ الاسلام نے بہ مقام احمد آباد محلّہ استوریہ میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اس کا نام مدرسہ ہدایت بخش رکھا، ۱۶۹۷ء میں اسی کے ساتھ ایک مسجد بھی تعمیر کی، ۱۶۹۰ء میں ان عمارتوں کی ابتدا ہوئی اور ۱۶۹۹ء میں مدرسہ، مسجد، دارالاقامہ وغیرہ

تمام عمارتیں مکمل ہو گئیں، اس کی تعمیر میں ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے صرف ہوئے تھے، طلبا کے وظائف اور اخراجات کے لیے متعدد گاؤں وقف تھے (۳۱)، اس مدرسہ کے مشہور مدرس مولانا نور الدین گجراتی تھے، مدرسہ ہدایت بخش میں دینی علوم کے علاوہ منطق، فلسفہ، ریاضی وغیرہ علوم کی اعلا پیمانے پر تعلیم دی جاتی تھی، اس کے ساتھ ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا، اس مدرسہ کے سالانہ اخراجات کا کوئی مستقل بندوبست نہ تھا، مدرسین اور طلبا بے حد پریشان رہا کرتے تھے، اس لیے طالب علموں نے عہد عالم گیری کے منصب دار شیخ غلام محمد (۳۲) کے توسط سے ایک درخواست بادشاہ کے حضور میں ارسال کی، اس درخواست سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اس مدرسہ میں سات ماہر فن اساتذہ تعلیم دیتے تھے جن میں ملا محمد حسین، ملا شیخ محمد، سید ہاشم، سید احمد، ملا عبدالنبی، شیخ اللہ بخش، شیخ نورالدین وغیرہ نمایاں تھے، آخر الذکر اس مدرسہ کے افسر اعلا تھے، ان اساتذہ نے طلبا کی درخواست پر اپنی اپنی سفارش بھی لکھی ہیں، سفارش میں مدرسہ کی نوعیت اور طلبا و اساتذہ کی ضرورت اور مدرسہ کی موجودہ فوقیت وغیرہ کا ذکر بھی کیا ہے، ملا عبدالنبی تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ شان دار مدرسہ تنگ دست معلمین اور نادار طلبا سے بھرا ہوا ہے اور خلیفہ کی امداد و اعانت کا مستحق ہے''۔ (۳۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علمائے حق سفارش کرنے میں کس طرح اپنے وقار کو قائم رکھتے تھے اور سوال سے پرہیز کرتے تھے، ہر استاذ نے اپنی سفارش میں تین باتوں کا اظہار کیا ہے کہ مدرسہ بڑا ہے، طلبا سے بھرا ہوا ہے اور ہم بادشاہ کی توجہ اور عطیہ کے محتاج ہیں، ایک ہی مضمون کو مختلف اساتذہ نے مختلف عبارتوں میں ادا کیا ہے جو ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہے، مولانا سید ابوظفر ندوی درخواست کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ درخواست غیر ملکی طلبا نے لکھی تھی جن میں عبدالکریم قطبی بخاری، زین العابدین شیرازی، رحمت اللہ مغربی، محمد عوض تورانی کے نام قابل ذکر ہیں، درخواست غیر ملکی طلبا کی طرف سے اس لیے لکھی گئی تھی تاکہ بادشاہ پر اس کا اثر پڑے، درخواست کا مضمون درج ذیل ہے۔

''احمد آباد کے مدرسہ ہدایت بخش کے ہم طلبا عرض پرداز ہیں کہ بادشاہ

کے مبارک عہد میں صدر صوبہ شیخ اکرام الدین کی سعی و کوشش سے مدرسہ، مسجد اور دارالاقامہ وغیرہ بڑے وسیع پیمانے پر تعمیر ہوئے جہاں طلبا دینی علوم حاصل کرتے ہیں اور علما روحانی مسائل حل کرتے ہیں، بڑے بڑے علما مدرسہ سے فارغ ہو کر اسی مدرسہ میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں، مدرسہ احمد آباد اور دوسرے مقامات کے طلبہ سے بھر گیا ہے، جن کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے، صدر مذکور ان تمام طلبا کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے، اس لیے ہم لوگ بڑی تنگی اور عسرت کے ساتھ گزارہ کر رہے ہیں، ہم لوگ امیدوار ہیں کہ کچھ بہ قدر کفاف طلبا اور کچھ مدرسہ کے اخراجات کے لیے مرحمت ہوتا کہ فراغ بالی کے ساتھ ہم لوگ کسب کمال میں مشغول اور دعائے خیر کرتے رہیں اور ابدالآباد تک یہ مدرسہ جاری رہے اور دین داری قائم رہے"۔ (۳۴)

یہ پتہ نہیں چلتا کہ مذکورہ درخواست پر عمل ہوا یا نہیں لیکن مرأة احمدی میں تین گاؤں کے وقف کا ذکر ہے جن میں ایک میلاد مبارک کے اخراجات کے لیے اور دوسرا اور تیسرا طلبا و مدرسہ کے اخراجات کے لیے جو دو روپیہ روزآنہ تھا۔ (۳۵)

اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت میں سیالکوٹ کی علمی شان و شکوہ کا پتہ چلتا ہے، اس شہر نے اس عہد میں بڑی علمی مرکزیت حاصل کرلی تھی، یہاں کے مدرسہ کے سربراہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے، ان کے بعد ان کے صاحب زادے ملا عبداللہ اس مدرسہ کے مہتمم ہوئے، سیالکوٹ کی علمی مرکزیت کا نشان عہد اکبری کے بعد سے ملتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں علم و فضل کا چرچا بہت پہلے سے تھا۔

مدرسہ بیانہ: من جملہ دیگر مدارس کے بیانہ کا ایک مدرسہ قابل ذکر ہے جس کو مولوی قاضی رفیع الدین نے قاضیوں کی مسجد سے متصل قائم کیا تھا، مدرسہ کی عمارت پر جو کتبہ ہے اس سے مدرسہ کی سال بنا ۱۰۷۰ھ معلوم ہوتی ہے (۳۶)، عہد اورنگ زیب سے متعلق کئی پروانے اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ دور دراز کے علاقوں اور صوبوں میں اورنگ زیب کے حکم سے امرا نے تعلیم کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا، اس طرح کے پروانوں میں دو پروانے

دیوبند سے متعلق ہیں جن کا ذکر ماہنامہ برہان کے ایک مقالے " دیوبند میں علم کی پہلی درس گاہ عہد عالم گیری کے دو پروانے" میں ہے، اس میں لکھا ہے کہ دیوبند میں سادات کا ایک خاندان آباد ہے جس کے مورث اعلا کا نام سید محمد ابراہیم تھا، دیوبند اور اس کے اطراف و جوانب میں دعوت و تبلیغ کا کام اسی بزرگ نے انجام دیا، اسی خاندان میں عہد عالم گیری کے دو پروانے ہیں جن سے دیوبند کے علاقے میں تعلیمی ترقی کا پتا چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عام روش کے مطابق خانقاہوں میں تزکیہ و تذکیر کے ساتھ ساتھ تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ (۳۷)

اس پروانے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند میں علم کی غالباً یہ اولین شمع تھی جس کو گیارہویں صدی کے اوائل میں سید محمد ابراہیم کے مبارک ہاتھوں نے روشن کیا تھا، یہ پروانے سید وجیہہ الدین، سید محمد صابرین، سید محمد عارف سے متعلق ہیں جیسا کہ پروانے میں مندرج عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

پہلا پروانہ اورنگ زیب عالم گیر کے زمانہ میں غضنفر صوبے دار شاہ جہاں آباد کی مہر خاص سے ۲۷ رشوال ۲۶ رجلوس عالم گیری مطابق ۱۰۹۳ھ میں جاری ہوا تھا اور دوسرا ۳۰ رجلوس عالم گیری مطابق ۱۰۹۷ھ میں صادر ہوا تھا، ان کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عطایائے معافیات کے کئی مقاصد تھے، ایک تو وسائل معاش سے مطمئن کرنا لیکن اصل مقصد طلبائے علوم دینیہ اور طالبان طریقت کے طعام و قیام کے مصارف تھے، اس زمانہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جو لوگ متوکلاً علی اللہ علم اور دین کی خدمات محض لوجہ اللہ انجام دیتے تھے، حکومت وقت وظائف و معافیات کے ذریعہ ان کو مالی امداد بہم پہنچاتی تھی، بادشاہوں اور امرا کی فیاضی اور قدردانی سے قصبہ قصبہ اور قریہ قریہ تک علما اور مدرسین پھیلے تھے، ان کو جاگیریں اور معافیاں ملتی تھیں اور وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں لگے رہتے تھے۔ (۳۸)

ایک اور پروانہ شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد ۱۶۸۴ء میں سیف خاں کی مہر خاص سے جاری ہوا جس پر عنایت خانزادہ شاہ عالم گیر کی مہر لگی ہوئی ہے، یہ پروانہ صوبہ الہ آباد سرکار منک پور پرگنہ جائس کے متصدی کے نام اور سید محمد فاضل سے متعلق ہے، پروانے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ طالب علم ہے اور وظیفے کا اہل ہے، اس کے پاس ذریعہ معاش نہیں ہے، اس لیے پروانہ

کے ذریعہ اسے پرگنہ کے قرب و جوار میں سو بیگہہ لائق زراعت زمین بلا ٹیکس آیندہ فصل خریف کی ابتدا سے دینے کی سفارش کی گئی ہے اور یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ اسے کسی طرح بھی پریشان نہ کیا جائے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ بغیر کسی پریشانی کے اپنی تعلیم میں مشغول رہے (۳۹)، ان سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ شاہان مغل کسی بھی طرح تعلیم کی ترویج و اشاعت نیز غریب و لاچار طلبا سے غافل نہیں رہتے تھے بلکہ ان کے تعاون میں پورا حصہ لیا کرتے تھے، مسلم سلاطین اور بادشاہوں نے اطراف ہند میں بہ کثرت مدارس قائم کیے، ملک میں جہاں جہاں علما اور معلمین رہتے تھے ان کے لیے خزانہ شاہی سے وظائف مقرر کیے جاتے تھے، طلبا و اساتذہ کے لیے اوقاف کی مدیں عام تھیں جن سے ان کے مصارف ذاتی و تعلیمی پورے کیے جاتے تھے، ان ہی وظائف کو مدد معاش کہتے تھے، اس طریقہ کے باعث تعلیم مفت، عام اور سہل الحصول ہوگئی تھی، یہاں اس کی صراحت ضروری ہے کہ مدد معاش کی رقم میں ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ تھی بلکہ دونوں قوموں کے مذہبی اشخاص کے لیے یہ رقمیں مقرر ہوتی تھیں۔

مدارس کے نظام تعلیم و تربیت میں نصاب کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، نصاب تعلیم ہی دراصل تعلیم کے بنیادی مقاصد کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ ہوتا ہے اور طلبا کی تعلیمی زندگی کی نشو و نما اور ان کی صلاحیتوں کی آب یاری میں ایک موثر کردار ادا کرتا ہے، نصاب سے ہی مسلمانوں کے تعلیمی رجحانات اور فکری میلانات کا پتا چلتا ہے، عہد وسطیٰ میں مدارس کی کثرت کے باوجود اعلا تعلیم کے تحت درس و تدریس کا معروف طریقہ یہ تھا کہ مختلف علوم و فنون کے لیے انفرادی تدریسی مرکز قائم تھے، جہاں اساتذۂ فنون اپنی دل چسپی کے خاص مضمون میں درس دیتے تھے اور طلبا و شائقین علم اپنی دل چسپی کے مطابق ان کے درس میں یکے بادیگرے شریک ہوتے تھے، اس طریقۂ تعلیم میں نہ تو درجات کی کوئی واضح تقسیم تھی اور نہ کسی خاص نظام الاوقات کے تحت مدت تعلیم کی تحدید، نہ مدرسہ کی قیود اور بندش، اس صورت حال میں ظاہر ہے کہ درس و تدریس کے لیے کوئی باقاعدہ نظام متعین نہیں کیا جاسکتا تھا بلکہ ہر مضمون کے لیے کچھ کتابیں منتخب کی جاتی تھیں، اس لیے عہد وسطیٰ کے تعلیمی نظام سے متعلق نصاب تعلیم کے بجائے درسیات کی اصطلاح استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

زیر بحث عہد میں اعلا تعلیم کے مرحلے میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، ادب و علم معانی، منطق و فلسفہ، علم کلام و تصوف، ہیئت و ریاضی، کیمیا و طب جیسے مضامین پڑھنے پڑھانے کا رواج تھا، جن لوگوں کو مختلف علوم و فنون کے سیکھنے کا شوق ہوتا تھا وہ ماہر اساتذہ سے فرداً استفادہ کرتے تھے جیسے درس نظامیہ کے بانی ملا نظام الدین کے بارے میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم سہالی میں اپنے والد ملا قطب الدین سے حاصل کی پھر قصبہ دیوہ جاکر مولانا عبدالسلام دیوی سے استفادہ کیا اور پھر جانس میں متعدد کتابیں ملا علی قلی سے پڑھیں، معروف روایت کے مطابق انہوں نے انتہائی کتابوں کے لیے مولانا امان اللہ بناری سے رجوع کیا اور صاحب سبحۃ المرجان کے مطابق انہوں نے یہ کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے پڑھیں (۴۰)، ملا نقشبند سے علم ہیئت کا رسالہ ''قوشجیہ'' پڑھا اور سلوک و تصوف کے میدان میں شاہ عبدالرزاق بانسوی سے فیض یاب ہوئے (۴۱)، درسیات میں اگرچہ ہمیشہ تغیرات و انقلابات ہوتے رہے تاہم چند کتابیں ان تغیرات سے محفوظ رہیں اور وہ اب تک عربی و فارسی کے نصاب میں داخل ہیں جیسے گلستان و بوستان اور سکندر نامہ وغیرہ، اسی طرح مراۃ احمدی سے پتا چلتا ہے کہ کشاف بھی درسیات میں داخل تھی، درسیات میں تبدیلی سے متعلق تاریخ سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ اس سرزمین پر مسلمانوں کی آمد کے ساتھ تعلیم کا رواج ہوا اور جو تبدیلیاں عراق و ماوراء النہر میں ہوتی رہتی تھیں، اس کا اثر یہاں کے نصاب پر بھی پڑتا تھا، اکبر کے زمانے میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے عضد الملک کے خطاب سے عزت پائی، ان کے آتے ہی درس گاہوں میں نئی چہل پہل نظر آئی، اسی زمانے میں حکیم شمس الدین اور ان کے بھانجے حکیم علی گیلانی کی وجہ سے طب کو فروغ ہوا اور شیخ عبدالحق نے حدیث کو رواج دیا۔ (۴۲)

اسی زمانے میں قاضی ضیاء الدین باشندہ نیوتنی نے گجرات جاکر شیخ وجیہہ الدین کے دامن تربیت میں پرورش پائی، ان سے شیخ جمال نے استفادہ کیا، ان سے ملا لطف اللہ نے علم حاصل کیا، ان کے شاگردوں میں ملا جیون صاحب نورالانوار، ملا علی اصغر، ملا محمد امان، قاضی علیم اللہ بہت زیادہ نامور ہوئے اور ہر ایک صاحب سلسلہ اور صاحب درس ہوگیا، مفتی عبدالسلام جو شاہ فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے چالیس سال تک لاہور میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، دیوہ

کے مفتی عبدالسلام اور الہ آباد کے شیخ محب اللہ لاہور سے تعلیم حاصل کر کے آئے اور اپنے لیے مسند فضیلت علاحدہ قائم کرلی، ملا نظام الدین کے والد شیخ قطب الدین سہالوی ان ہی دونوں کے شاگرد تھے (۴۳)، الہ آباد میں شیخ محب اللہ، محمد آصف، شیخ محمد افضل، شاہ خوب اللہ، شیخ محمد طاہر، مولوی برکت، مولوی جار اللہ اور دیگر باکمال علما نے ایک مدت تک سلسلہ درس و تدریس کو گرم رکھا، لکھنؤ میں شیخ اعظم اس کے بعد شاہ پیر محمد نے بزم افادہ گرم کی اور ان کے شاگرد ملا نقشبند نے اس کو خوب رونق دی اور شیخ قطب الدین سہالوی کی شہادت کے بعد ان کے نامور فرزند ملا نظام الدین نے علم کے دریا بہائے اور لکھنؤ کو علم کا مرکز بنادیا اور جو نصاب مقرر کیا، اسی کو ہندوستان کی ہر ایک درس گاہ میں قبول کیا گیا، جہاں تک مغلیہ عہد میں درسیات میں شامل کتابوں کی بات ہے تو ان کی فہرست درج ذیل ہے، نحو میں کافیہ، شرح جامی، منطق میں شرح شمسیہ، شرح مطالع، فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، کلام میں شرح عقائد نسفی مع حاشیہ خیالی، شرح مواقف، فقہ میں ہدایہ کامل، شرح وقایہ، اصول فقہ میں حسامی، توضیح، تلویح، بلاغت میں مختصر مطول، ہیئت و حساب میں بعض رسائل مختصرہ" تجرید اقلیدس شرح تذکرہ" طب میں موجز القانون، تفسیر میں مدارک، بیضاوی، حدیث میں صحیح بخاری، مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، تصوف و سلوک میں عوارف المعارف، رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص وغیرہ۔ (۴۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی نے عہد اکبری کے نصاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "صرف ونحو کے بعد شرح شمسیہ قطبی، شرح حکمۃ اربعین، اس کے بعد شرح تجرید طوسی یا حواشی اور اس کے بعد شرح اشارات، شرح شفا، حکمۃ الاشراق وغیرہ درس میں پڑھائی جاتی تھیں"۔

اورنگ زیب کے عہد میں بھی نصاب میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ان تبدیلیوں کے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل نہیں مل سکی البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ فرنگی محل کے قیام کے بعد درسیات میں بہت زیادہ تبدیلیاں آئیں، مثلاً فرنگی محل کے قیام سے پہلے ہر فن میں کثیر تعداد میں کتابیں داخل درس تھیں ملا قطب الدین شہید نے یہ طریقہ قائم کیا کہ صرف ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا اور اضافہ کیا یعنی ہر فن کی دو دو کتابیں لیں اور نصاب کا ایک بوجھ جو طالبان علم پر ہوتا تھا وہ اورنگ زیب کے عہد میں ہلکا ہوا اور حاشیہ قدیمہ و جدیدہ وغیرہ جن

کو ملا فتح اللہ شیرازی نے ہندوستان میں رواج دیا تھا، سب نصاب سے خارج ہوگئے (۴۵)، ملا نظام الدین کا طریقہ درس یہ تھا کہ وہ کتاب کو محض ذریعہ تعلیم قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے، اسی طرز تعلیم کا نتیجہ ملا کمال الدین، بحر العلوم اور احمد اللہ جیسے جید علما کی شکل میں سامنے آیا۔

اورنگ زیب عالم گیر کو اس بات کا بے حد خیال رہتا تھا کہ جو کتابیں داخل درس ہوں، ان میں مسلمانوں کے عقائد کے خلاف کوئی چیز نہ ہو، محب اللہ الہ آبادی کے رسالہ تسویہ میں بعض قابل اعتراض باتیں اورنگ زیب کو نظر آئیں، اس پر اورنگ زیب نے اپنے استاذ میر سید محمد قنوجی اور شیخ محمدی سے وضاحت چاہی، سید قنوجی تو شرح نہ کرسکے، شیخ محمدی سے اورنگ زیب نے کہا کہ اگر آپ شیخ محب اللہ کی مریدی کا دعوا کرتے ہیں تو ان کے رسالہ کے مقدمات کو شرعی احکام کے مطابق بتائیں، شیخ محمدی نے جواب دیا کہ جس مقام سے شیخ نے گفتگو کی ہے مجھے وہاں تک رسائی حاصل نہیں جس وقت میں اس رتبہ کو پہنچ جاؤں گا تو آپ کے حکم کے بہ موجب اس کی شرح لکھ دوں گا اور اگر آپ نے اس رسالہ کو جلانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس فقیر کے گھر سے کہیں زیادہ شاہی مطبخ میں آگ موجود ہے، اورنگ زیب عالم گیر یہ جواب سن کر خاموش ہوگیا (۴۶)، عہد اورنگ زیب کے آخری ایام میں درس نظامی کی تنظیم ہندوستان میں عربی تعلیم کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے گاؤں، قصبے اور شہر میں مدرسے اور مکتب تعمیر ہوچکے تھے، عالموں اور قاضیوں کی کثرت تھی اور ساتھ ہی ہندوستان میں تجدید و اجتہاد کی ہوائیں اٹھ رہی تھیں، یہی وجہ ہے کہ عربی اور اسلامی تعلیم و تدریس کا پہلا منضبط اور ہمہ گیر نصاب درس نظامی کے نام سے عہد اورنگ زیب میں مرتب ہوا (۴۷)، درس نظامیہ عالم گیر کی وفات کے بعد مدون ہوا لیکن ملا نظام الدین کو جن کے نام پر یہ طریق تدریس نظامیہ کہلاتا ہے، عالم گیر کا ہی مرہون منت ہے، اس طریق تعلیم میں جو کتابیں رائج ہیں ان کا اکثر حصہ عہد عالم گیری میں لکھا گیا، بعد کے دور میں علوم اسلامی نے جو فروغ پایا اور دین کا جو احیا ہوا اس کی بنیاد عہد عالم گیری میں رکھی گئی، بادشاہ کی علم نوازی اور قدر دانی علما سے علم و فضل کو بے حد فروغ ہوا۔

مغلوں کے عہد حکومت میں طلبا کو اپنی دل چسپی کے مضامین پڑھنے کی پوری آزادی تھی، تعلیم کا ایک نظام ضرور تھا لیکن اس نظام میں اس کی کافی گنجائش تھی کہ علم کے جویا متداول علوم اور

کتابوں کے انتخاب میں اپنے اختیار سے کام لے سکیں، اس کی مثال عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، ان لوگوں نے متداول نصاب کا تھوڑا سا ہی حصہ پڑھا تھا، انہیں حدیث، تصوف اور دوسرے علوم سے زیادہ دل چسپی تھی، اس وقت کے نصاب تعلیم پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی، بلاشبہ قرآن پڑھا جاتا تھا اس کے مباحث اور مضامین پر غور و فکر بھی ہوتا تھا لیکن یہ علما کے ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود تھا۔

اورنگ زیب کی علمی سرپرستی، علما کی قدر دانی اور تعلیمی سرگرمیوں کے مطالعہ سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ایک مکمل تعلیمی منصوبہ تھا جس پر عمل کر کے اس نے تعلیم کا ایک صاف ستھرا تصور پیش کیا اور طلبا و مدرسین کو سہولت فراہم کر کے فروغ تعلیم اور ترویج و اشاعت کے لیے راہ ہم وار کی۔

حواشی و مراجع

(۱) ریاست علی ندوی، اسلامی نظام تعلیم، دارالمصنفین اعظم گڈھ طبع سوم، ۱۹۹۲ء ص ۴۶ (۲) مولانا ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۷۱ء ص ۱۴-۱۵ (۳) ایضاً ص ۲۴، سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم تیموریہ جلد اول، دارالمصنفین، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲ (۴) مولانا ابوالحسنات ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۳ (۵) سید صباح الدین عبدالرحمن، حوالہ مذکورہ، ص ۱۰۱ (۶) مولانا ابوالحسنات ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۳ (۷) ابوالفضل، آئین اکبری جلد اول، ص ۱۴۳ (۸) خافی خاں، منتخب اللباب جلد اول، کلکتہ ۱۸۶۹ء، ص ۲۳۹ (۹) بحوالہ مولانا ابوالحسنات ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۵ (۱۰) سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم تیموریہ جلد دوم، ص ۲۴۶ (۱۱) پروفیسر خلیق احمد نظامی، ''اسلامی فکر اور تہذیب کا اثر ہندوستان پر'' لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۳۳ (۱۲) محمد بختاور خاں، ''مرأۃ العالم'' جلد دوم، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۴۴۵ (۱۳) ساقی مستعد خاں، مآثر عالم گیری اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۳۸۸ (۱۴) منشی محمد کاظم، عالم گیر نامہ فارسی جلد دوم، کالج پریس کلکتہ، ۱۸۶۸ء، ص ۸۶-۱۰۸۵ (۱۵) علی محمد خاں، مرأۃ احمدی جلد اول، مطبع نامی گرامی فتح الکریم بمبئی، ۱۳۰۷ھ، ص ۲۷۲ (۱۶) این این لا، پروموشن آف لرننگ ان محمڈن انڈیا، بمبئی، ۱۹۱۶ء، ص ۱۸۸، اشفاق علی، ملا جیون کے معاصر علما، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۳۹، ظہیر الدین فاروقی، اورنگ زیب اینڈ ہز ٹائمز، دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۵۲۰ (۱۷) علی محمد خاں، مرأۃ احمدی جلد اول، ص ۷۸-۳۷۷

سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم تیموریہ جلد سوم، ص ۹۰ (۱۸) علی محمد خاں، مرأۃ احمدی، ص ۳۰۹ (۱۹ و ۲۰) بحوالہ قاضی اطہر مبارک پوری، دیار پورب میں علم اور علما، ندوۃ المصنفین دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۹۱-۹۰ (۲۱) شیخ محمد اکرام، رود کوثر، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۵۳۵ (۲۲) مولانا ابوالحسنات ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۷ (۲۳) ایضاً ص ۴۰ (۲۴) مقالات شبلی جلد سوم، دارالمصنفین، ص ۱۰۷ (۲۵) شیخ محمد اکرام، حوالہ مذکورہ، ص ۴۰۴ (۲۶) مقالات شبلی، ص ۱۱۳ (۲۷ و ۲۸) مولانا ابوظفر ندوی، گجرات کی تمدنی تاریخ، دارالمصنفین اعظم گڈھ، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۱ و ۲۰۶ (۲۹) مولانا ابوالحسنات ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۴۶ (۳۰) مولانا ابوظفر ندوی نے اس کا نام مدرسہ ہدایت بخش اور مولانا ابوالحسنات ندوی نے مدرسہ شیخ الاسلام لکھا ہے جسے اکرام الدین نے قائم کیا تھا (۳۱) مولوی غلام علی آزاد، مآثر الکرام جلد اول، ص ۱۰۸، بحوالہ ابوظفر ندوی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۰۷ و ابوالحسنات حوالہ مذکورہ، ص ۸۷ (۳۲) شیخ غلام محمد شاہزادہ اعظم شاہ صوبہ دار احمد آباد کی ملازمت میں رہتے تھے، یہ صاف طور پر پتا نہیں چلتا کہ وہ کس عہدہ پر تھے اور ان کا کیا کام تھا لیکن جو فرامین وغیرہ اس زمانے کے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ بادشاہ تک درخواستیں پہنچانے کا کام کیا کرتے تھے جس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ درباری پیش کار رہے ہوں گے (۳۳) بحوالہ ابوظفر ندوی حوالہ مذکورہ، ص ۲۱۰ (۳۴) ایضاً ص ۲۱۲-۲۱۱، اس درخواست کے بارے میں ابوظفر لکھتے ہیں کہ یہ درخواست گجرات کے اس مدرسے میں میرے مطالعہ کے وقت موجود تھی (۳۵) این، این لا، حوالہ مذکورہ، ص ۱۸۹، ظہیر الدین فاروقی، حوالہ مذکورہ، ص ۵۲۱، مرأۃ احمدی جلد اول، ص ۳۴۴ (۳۶) آرکیالوجیکل سروے رپورٹ جلد ۲۰ ص ۷۷-۷۶، این، این لا، حوالہ مذکورہ، ص ۱۸۹، ظہیر الدین فاروقی، حوالہ مذکورہ، ص ۵۲۱ (۳۷) ماہنامہ برہان، اگست ۱۹۴۵ء، (۳۸) سید صباح الدین عبدالرحمن، ''علما و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر''، دارالمصنفین ۱۹۷۰ء، ص ۶۵ (۳۹) ڈاکٹر آر۔ کے پرتی، کیلنڈر آف اکوائرڈ ڈاکومینٹس (۱۳۵۲-۱۷۵۴) جلد دوم، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۰ (۴۰) غلام علی آزاد بلگرامی ''سبحۃ المرجان'' علی گڑھ، ۱۹۷۶ء، ص ۳۹، رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، نول کشور، ۱۹۱۴ء، (۴۱) مقالات شبلی، حوالہ مذکورہ، ص ۱۱۴ (۴۲) سید عبدالحئی ''ہندوستان کا نصاب درس اور اس کے تغیرات''، ندوہ لکھنؤ، ص ۸ (۴۳) مولانا سید عبدالحئی، حوالہ مذکورہ، ص ۹ (۴۴) ایضاً ص ۹ و ۱۰ (۴۵) مولانا مناظر احسن گیلانی، نظام تعلیم و تربیت، ص ۲۷۰ (۴۶) عہد وسطیٰ کے تمدنی جلوے، حوالہ مذکورہ، ص ۲۲۵-۲۲۴ (۴۷) شاہ نواز خان، مآثر الامرا، جلد سوم، ص ۶۰۷-۶۰۶، بزم تیموریہ، حوالہ مذکورہ، ص ۹۰، علی جواد زیدی، فکر و ریاض، ص ۱۴۲۔

****

غنی کاشمیری

از:- پروفیسر عبدالاحد رفیق☆

محمد طاہر غنی برصغیر ہندو پاک کے ایک اعلا پایہ فارسی شاعر تھے، کشمیر میں فارسی شعرا کے آپ گل سرسبد کہلانے کے لائق ہیں، غنی اسم با مسمیٰ درویش مزاج تھے، ان کے مفصل حالات زندگی کہیں نہیں ملتے، علی جواد زیدی نے تمام معلومہ ماخذ سے کچھ تفصیلی معلومات جمع کی ہیں اور غلط وصحیح اطلاعات میں فرق و امتیاز کرنے کی کوشش کی ہے، اگر کچھ اور معاصر حوالے مل جاتے تو ان کی زندگی کے متعلق مزید معلومات حاصل ہوتیں، یقینی طور پر اتنا معلوم ہے کہ ان کا نام محمد طاہر تھا، اشائی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اشائی کوچہ راجوری کدل سری نگر میں تولد ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی تھی، عربی فارسی اور دیگر علوم مروجہ اس دور کے مشہور کشمیری فارسی شاعر ملا محمد بابا فغانی سے حاصل کی تھی، بہ قول نصرآبادی زبان وادب کے رموز بابا فغانی سے ہی حاصل کیے تھے، تاریخ ولادت معلوم نہیں، شروع میں طاہر تخلص اختیار کیا تھا اور بعد میں غنی تخلص کرتے رہے، تاریخ وفات ۱۰۷۹ھ ہے، اشائی کوچہ میں اپنے خاندانی مقبرے میں آرام فرما ہیں، جہاں ان کا مدفن بے کسی کا رونا بہ زبان حال رو رہا ہے اور **اہل کشمیر کی غفلت شعاری اور** بے پروائی آشکار ہے، قریب العصر تذکرہ کلمات الشعرا کے مولف محمد افضل سرخوش نے یہ بتا کر ہمیں مغالطے میں ڈال دیا ہے کہ "غنی اس کے شعر کہنے کا تاریخ ہے، غنی کے اعداد ۱۰۶۰ نکلتے ہیں، حالاں کہ معلومہ ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے ان کے اشعار کا چرچا تھا، ایران کے نامور سخن ور مرزا محمد علی صائب ظفر خان احسن صوبے دار کشمیر کے ہمراہ ۱۰۴۳ھ میں یہاں آئے اور وہ غنی کے اشعار سے بہت ہی متاثر ہوئے، انہوں نے غنی کے تتبع میں یہ غزل کہی ؎

☆ سنیل فیکٹری روڈ، اپر صورہ، سری نگر۔

در جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد ایامی کہ دیگ شوق ما سرپوش داشت

اس واقعہ سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ۱۰۴۳ھ میں غنی کا کلام اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ایک ایرانی شاعر ان کے کلام سے متاثر ہوا، کم سے کم اس وقت ان کی عمر ۲۰ سال کے درمیان تو رہی ہوگی، تذکرہ مرأۃ الخیال مرتبہ ۱۱۰۲ھ نے بھی یہ لکھ کر اس مغالطے کو تقویت دی کہ غنی نے عین شباب میں وفات پائی، حالاں کہ غنی نے خود اپنی پیری اور توانائی کا ذکر بار بار اپنے اشعار میں کیا ہے ؎

ز پیری چناں گشتہ ام ناتواں
کہ دندان بجند بجائی زبان
آدمی در عہد پیری بے خرد گردد غنی
می شمارم طفل خود را ریخت تا دندان مرا

غنی نے اعلا تعلیم مدرسہ قطب الدین پورہ میں حاصل کی جہاں شیخ محسن فانی پرنسپل تھے، چنانچہ محمد علی ماہر نے غنی کی جو تاریخ وفات کہی ہے، اس سے معلوم ہوا ہے کہ محسن فانی ان کے استاد تھے مگر علی جواد زیدی کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے کہ غنی کے اساتذہ میں صرف ملا محمد محسن فانی کا ذکر ملتا ہے، کیوں کہ تذکرہ نصرآبادی نے لکھا ہے کہ بابا فغانی کشمیری سے غنی نے تعلیم حاصل کی ہے۔(۱)

غنی کے چھوٹے بھائی ملا محمد زمان نافع بھی شاعر تھے اور اپنے برادر غنی کی طرح درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور وہ بھی صاحب دیوان شاعر تھے مگر آج ان کے دیوان کا کوئی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے، البتہ بعض تذکروں میں ان کے چند اشعار ملتے ہیں جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں بھی پختگی، روانی اور دل نشینی پائی جاتی ہے، بلکہ انہوں نے کشمیر کی ایک مستند تاریخ بھی مرتب کی تھی جس کے دو قلمی نسخے مرحوم ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء کے دوران کشمیر میں مرحوم مفتی محمد سعادت کے کتب خانے واقع جامع مسجد اور

(۱) تذکرہ شعرائے کشمیر، مرزا اصلح و تذکرہ نصرآبادی حالات بابا فغانی۔

شعبۂ تحقیقات کے کتب خانے میں دیکھے تھے، اگر آج یہ کتاب ملتی تو غنی کے حالات زندگی پر کافی مواد فراہم ہوتا۔

اگرچہ غنی کے زمانۂ حیات میں ظفرخان احسن اسلام خان اور سیف خان کے سے علم دوست اور ادب نواز امرائے کشمیر میں موجود تھے اور ان میں اسلام خان سے تو ان کے گہرے روابط بھی تھے، لیکن انہوں نے شاعری کو کبھی کسب زر کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کبھی کسی سے صلۂ شعر کے طالب ہوئے، "تاریخ جدولیہ" میں یہ بات ضرور ظاہر کی گئی ہے کہ غنی نے ۲۵ جلوس شاہ جہاں میں ایک قصیدہ شاہ جہاں کی خدمت میں پیش کر کے ہزاروں روپیہ انعام میں پایا لیکن مولوی اکرم الحق سلیم کا خیال ہے کہ مورخ کو تسامح ہو گیا ہے اور وہ فروغی کو غنی سمجھ بیٹھا ہے۔

بعض قلمی نسخوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک رباعی اورنگ زیب کی مدح میں اور ایک اس کے گھوڑے کی تعریف میں لکھی ہے جو شامل دیوان ہے، یقیناً اورنگ زیب سے غنی کو کسی صلہ کی امید نہ رہی ہوگی، بلکہ انہوں نے اس بادشاہ کی فقیر منشی سے متاثر ہو کر رباعی کہی ہوگی، تذکروں میں آیا ہے کہ جب سیف خان کی وساطت سے اورنگ زیب نے انہیں دلی طلب کیا تو غنی نے جانے سے انکار کر دیا۔

غنی کے ہم عصر شعرا میں مرزا صائب تبریزی ابوطالب کلیم، میر الٰہی، طغرای مشہدی، سلیم تہرانی، محمد رفیع نشی، محمد افضل سرخوش وغیرہ وغیرہ ہو گزرے ہیں، ان میں سے صرف طغریٰ مشہدی نے غنی کشمیری کو بدی سے یاد کیا ہے مگر اس دور کے دوسرے شعرا کے ساتھ بھی طغریٰ مشہدی کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں، غنی نے اس کے بارے میں کہا ہے۔

طغرا کہ برد روح کثیفش چو جسد باصاف ضمیران شدہ دشمن ز حسد
گوید کہ برند شعرش ارباب سخن نامش نبرند تا بہ شعرش چہ رسد

غنی نے اپنے ایک معاصر کشمیری فارسی شاعر محمد رفیع نشی کی تعریف اس طرح کی ہے۔

شگفتہ ایم خزل در زمین طرح رفیع کہ می شود سخن ما دریں زمین کم سبز

اسی طرح انہوں نے ایک اور کشمیری فارسی شاعر قلندر کی تعریف میں کہا ہے۔

از اہل سخن کس بہ قلندر نہ رسد در شعر بہ او عرفی و سنجر نہ رسد

دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایک مکان تھا اور وہ مکان بھی دنیاوی مال ومتاع سے خالی تھا، ان کے شاگرد مسلم نے اپنے مرتب کردہ دیوان غنی کے دیباچے میں واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ان کے پاس کاغذ اور قلم دان کے علاوہ اسباب جہان سے کچھ بھی نہیں تھا، بس ایک بوریائے فقر زینت خانہ تھا اور غنی اسی میں مست تھے، انہوں نے کبھی اپنی بے بس زندگی کا رونا نہیں رویا ہے اور نہ کبھی ہمت اور حوصلے کو چھوڑ دیا ہے، انہوں نے اپنے زمانے کے امرا اور حکما سے فایدہ حاصل نہ کیا، کیوں کہ وہ امرا اور حکما کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان کی خودداری اور استغنا کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے پڑوسی کے تنور سے آگ مانگنے کو بھی عار تصور کرتے تھے، ان کا مکان آج بھی اشائی کوچہ راجوری کدل میں محکمہ پبلک ورکس کی مرمت کی وجہ سے قائم ہے۔

غنی تمام عمر مریض رہے، ان کے شاگرد مسلم نے اپنے مرتب کردہ دیوان غنی کے دیباچے میں لکھا ہے کہ وہ اکثر امراض جسمانی کی وجہ سے تنگ آچکے تھے اور بڑھاپے میں وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے، اپنے اکثر اشعار میں اپنے درد اعضا کا جابجا بیان کیا ہے اور غنی نے اپنی زندگی قناعت و ہمت سے بسر کی ہے اور کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

ما بہ فقر و فاقہ خود سندیم چو آسیا
گر رسد روزی غبار خاطر ما می شود

اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ میں اپنی ہمت اور حوصلے سے ہمیشہ مشکلات کے باوجود جوان رہا اور کسی کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوا۔

دائم جوانم از مد ہمت بلند یعنی ز بار منت کس خم نگشتہ ایم

غنی کی زندگی صرف درس وتدریس میں گزری اور درس وتدریس کا شغل ان کے خاندان میں ۱۹۱۰ء تک قائم رہا ہے، جب کہ ان کے بھائی محمد زمان نافع کی اولادوں میں سے آخری اولاد مولوی محمد شاہ عشاوری رحلت فرما گئے اور یہ خاندان امرت سر منتقل ہوا، جہاں ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے بے سروسامانی کی حالت میں لاہور ہجرت کر گیا، جہاں یہ لوگ اب شالوں کی تجارت کی وجہ سے متمول ہو گئے ہیں اور یہ خوش حال زندگی بسر کر رہے ہیں، غنی درس وتدریس سے ہی اپنا روزگار حاصل کرتے تھے، وہ کہتے ہیں۔

بسر بروم غنی ہر چند عمر کود بمکتا   نیا وردم رخط دشت خویش سر بیرون

تکلیف کی وجہ سے وہ ایک دفعہ درسی مشاغل سے محروم ہوگئے تھے، اس کا ذکر انہوں نے یوں کیا ہے:

افتاد ام از درس زدرد اعضا   کو شاگردی کے مانند اعضائی مرا

غنی کے دیوان میں بہ قول ڈاکٹر ظفر خان کل سرمایہ اشعار ۱۶۶۴ اور رباعیات ۲۸۴ اشعار اور مفردات ۴۶۹ شعر ہیں، ان میں سے اکثر بڑھاپے میں لکھے گئے ہیں، غنی اپنے دیوان کی طباعت کے سلسلے میں بھی بہت خوش قسمت رہے ہیں، اب تک کم از کم دیوان غنی گیارہ بار شائع ہو چکا ہے، کلچرل اکادمی (۱) نے بھی دیوان غنی کے دو ایڈیشن شائع کیے ہیں، اسی طرح دیوان غنی کے بے شمار نسخے دنیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، چنانچہ کلچرل اکادمی نے دیوان غنی کی ترتیب و تدوین کے وقت ۲۲ نسخوں سے استفادہ کیا ہے، دیوان کے اشعار کی داخلی شہادت سے اس قدر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے متاخرین فارسی شعرا میں غنی کو غیر معمولی شہرت اور قبول عام حاصل ہے، یہ شہرت کسی خاص طبقے یا خطے تک محدود نہیں رہی ہے، ہر دور میں غنی کے جاننے اور ماننے والے کشمیر سے راس کماری تک پھیلے رہے ہیں اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے، ہندوستان کے علاوہ ایران، افغانستان، تاجکستان، ازبکستان، قزاقستان کے علاوہ وسطی ایشیا کے ان تمام ممالک میں جہاں فارسی کا چلن تھا، غنی کا نام پہنچ چکا تھا، طرہ تو یہ ہے کہ مغل دور کے ملک الشعرا کے دواوین کو بھی وہ وسیع حلقہ اشاعت نصیب نہ ہوا جو دیوان غنی کے حصے میں آیا، غنی کو اپنے زمانہ حیات ہی میں ایک ہمہ گیر شہرت حاصل ہوگئی تھی۔

چناں نام من روشناس است در ہند   کہ نقش نگیں درمیان سیاہی

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

اشعار آبدارم تا شد محیط عالم   انداختند در آب یاران سفینہ ہا را

وہ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتے ہیں کہ کسی سے شعر کا صلہ حاصل کرنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے، میرے اشعار ہی میرے لیے باعث فخر وعزت ہیں۔

(۱) جموں وکشمیر اکاڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز۔

غنی چرا صلہ شعر از کسے گیرد   ہمیں بس است کہ شعرش گرفتہ عالم را

ان اشعار سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں دنیائے فارسی میں مشہور ہو چکا تھا، میر حسین دوست سنبھلی نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ صائب نے غنی کے ایک شعر کا مطلب دریافت کرنے کی غرض سے ایران سے کشمیر تک کا سفر کیا تھا، وہ یہ شعر تھا۔

موی میان تو شدہ کرا لہ بین   کرد جدا کا سہ سر ہا ز تن

لیکن سنبھلی کی روایت غلط معلوم ہوتی ہے کیوں کہ صائب کی آمد کے وقت ہندوستان میں اسباب کچھ اور ہی تھے، اگر ایسا ہوتا تو وہ سیدھے کشمیر آتے، نہ کہ جہاں گیر کے دربار میں۔

غنی کشمیری کا یہ دستور تھا کہ جب وہ گھر میں ہوتے تو گھر کا دروازہ بند رکھتے تھے اور جب گھر سے باہر جاتے تو دروازہ کھلا چھوڑ دیتے تھے، ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ اس عجیب وغریب طرز عمل کی کیا وجہ ہے؟ غنی نے جواب دیا:

''میں جو کچھ کرتا ہوں بالکل درست ہے اس مکان میں میرے علاوہ اور قیمتی شے کون سی ہے؟ اس لیے جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو متاع گراں'' کی حفاظت کرتا ہوں اور جب میں گھر سے باہر چلا جاتا ہوں تو پھر گھر میں باقی ہی کیا رہ جاتا ہے جس کی حفاظت کی جائے۔

علامہ اقبال نے اس واقعہ کو اپنی کتاب پیام مشرق میں ایک نظم کی صورت میں یوں پیش کیا ہے:

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر   نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرا بود در بستہ داشت   چو رفت از سر تختہ را وا گذاشت
یکے گفت اے شاعر دل رسے   عجب دارد از کار تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر   فقیر و باقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاراں رواست   دریں خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش   متاعے گرانست درخانہ اش
چو آں محفل افروز در خانہ نیست   تہی تر ازیں، ہیچ کاشانہ نیست

غنی اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بہت محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، ان میں

سے اکثر کی موت ان کے سامنے ہوئی اور اس بات نے انہیں ساری زندگی میں پریشان کر رکھا، اپنے ایک عزیز نوجوان خورشید کی وفات کا انہیں بہت صدمہ ہوا ہے اور اس صدمے کا اظہار انہوں نے اپنے کئی اشعار میں کیا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خورشید کا تعلق غنی سے کیا تھا لیکن اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو غنی کا قریبی عزیز تھا یا شاگرد- ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے والد کے ساتھ ان کے اچھے تعلقات نہ تھے۔

بالتفات پدر دل منہ کہ قطرہ آب   ز چشم ابر چو افتند در یتیم شود

دیوان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ساری زندگی غریبی اور عسرت میں گزری ہے، انہوں نے اپنے اشعار میں بتادیا ہے کہ میری زندگی کا کوئی بھی دن خوشی سے بسر نہیں ہوا، بلکہ میری زندگی شمع مزار کی طرح ماتم کناں رہی، میری زندگی کا پیمانہ کوکنار کی طرح زہر اور تلخ بن گیا اور میری ساری عمر بساط روزگار پر غم و آلام سے بسر ہوئی

غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ غنی مدت تک اپنے ہی شہر میں رہے لیکن یہ صحیح نہیں، خود غنی نے اپنی ایک رباعی میں ہندوستان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

کردہ است ہوای ہند دلگیر مرا   اے بخت رسان بباغ کشمیر مرا
گشتم ز حرارتِ غریبی بیتاب   از صبح وطن بدہ طباشیر مرا

دیوان غنی کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے درستی کردار اور اصلاح معاشرت پر کافی توجہ کی ہے، وہ اخلاق کے اعلا علم بردار تھے، ان کے سامنے عظمت کا معیار علم فضل، عبادت اور ریاضت تھا، مال و دولت اور جاہ و حشمت کو انہوں نے کبھی فوقیت نہیں دی اور نہ درخوار اعتنا سمجھا، انہوں نے ہمیشہ لڑکوں کو پڑھایا اور اس سے جو کچھ ملا اس پر اپنی زندگی بسر کی، عزت نفس، عالی ہمتی، بلند کرداری ان کا عالم گیر اصول تھا، مگر وہ ایک زاہد خشک ملا یا مولوی نہ تھے، وہ ہمیشہ گانا بجانے کو سننا پسند کرتے تھے اور حسن و عشق کی ایک ایک ادا سے واقف تھے، ان کی عشق و محبت میں ہوس کا شائبہ نہ تھا، وہ مغل دور میں کشمیریوں کی بے بسی بے چارگی اور محکومی کا بھی رونا روتے ہیں اور کبھی حالات سے اس قدر ناراض اور سنجیدہ ہوتے ہیں کہ عظیم انقلاب کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں، وہ مغل دور کے حکام کی ظلم و ستم کا بھی اظہار کرتے ہیں۔

انقلابے نعیم آباد جہاں می خواہم   شاید ایں طالع برگشتہ من برگردد
غنی در ملک دنیا، انقلابے آرزو دارم   کہ خاک از گردش گردوں غبار آسیا گردد

شاعری کی حیثیت سے غنی کا نام خاصا معروف رہا ہے، تمام تذکرہ نویسوں نے ان کے نکتہ رس ذہن کی تعریف کی ہے، محمد افضل سرخوش جو خود نکتہ یاب طبیعت رکھتے تھے، غنی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ غنی ایک خوش خیال، نازک بند، معنی یاب شاعر تھا، انہیں کی روایت ہے کہ صائب کہا کرتے تھے کاش جو کچھ میں نے اپنی زندگی میں کہا ہے وہ اس کشمیری شاعر کو دے دیتا اور اس کا یہ شعر مجھے ملتا۔

حسن سبزی بہ خط سبز مرا کرد اسیر   دام ہم رنگ زمیں بود گرفتار شدم

سراج الدین علی خان آرزو جو خود اعلا پایہ کے ادیب شاعر اور نقاد تھے، غنی کے متعلق ان کی رائے ہے کہ غنی کے مانند نہ کشمیر اور نہ ہی کسی دوسرے ملک میں متاخرین میں کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا ہے، تازہ مضامین کے بیان کرنے میں غنی کو کمال حاصل تھا، صفائی اور سلاست میں ان کے ہم عصروں میں ان کے مانند کوئی نہ تھا، عظمت اللہ بے خبر نے بھی لکھا ہے کہ ان کے مانند خطۂ کشمیر میں کوئی پیدا نہ ہوا اور نہ اس طرح فصاحت و بلاغت کے ساتھ شعر بیان کیے، ان کا کلام فی الحقیقت بہار کشمیر ہے، ان کا دیوان "شعرائے ندرت ادا" میں بے نظیر ہے، غنی کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری مقبول نہ ہوگی لیکن ان کے مرنے کے بعد ان کی شاعری کی خوش بو سارے عالم کو نافہ کی طرح معطر کرے گی۔

اکثر لوگ یہ سوال پوچھتے رہتے ہیں کہ کیا غنی غالب کی طرح شراب نوش اور رند تھے، اس سلسلے میں غنی کے معلومہ حالات پڑھ کر جو کچھ معلوم ہوتا ہے اور ان کی زندگی کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اس میں شراب نوشی کا گزر نہیں لیکن ان کے دیوان میں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے شراب سے لطف اندوز ہونے کا ذکر اس قدر واضح ہے کہ اسے محض نکتہ آفرینی تصور نہیں کیا جاسکتا، بعض مقامات پر شراب سے شراب حقیقت ہی مراد لی جاسکتی ہے لیکن بعض مقامات میں الفاظ کے تلازمات سے شراب سے مراد شراب مادی بھی ہوسکتی ہے۔

توبہ از می نکنم در پیری   میکشی در شب مہتاب خوش است

می نیست چو در کاسۂ سر ارعشہ در اعضاست — دستم بہ نظر پنجۂ طنبور نوازست
آدم خاکی ز خامی دارد از می اجتناب — کوزۂ گل پختہ چوں گردد نمی ترسد

غنی گرمی آواز اور تندی صبا کو بھی لازم و ملزوم سمجھتے ہیں، شراب کے بغیر آواز میں تیزی نہیں آتی، اس خیال کو انہوں نے دو شعروں میں بڑے دل پذیر انداز میں بیان کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کی تاثیر سے واقف ہیں۔

آتش مے تیز سازد شعلہ آواز را — بر کدوی بادہ باید بست تار ساز را
بود از شعلہ آوازِ قلقل بزم می روشن — سیرت گردم مکن خاموش ساقی شمع مینا را

غنی کو نغمہ بھی مرغوب ہے اور وہ صوف وساز دونوں کی دل نشینی اور تاثیر کو سمجھتے ہیں، ان کا قول ہے۔

رامن مطرب مدہ از دست در فصل بہار — رشتۂ گلدستۂ عیشت بود تار رباب

شعر کے بارے میں غنی کا نظریہ یہ ہے کہ تازہ مضمون کا حامل ہو، تہہ دار ہو، رنگین ہو، ان کا خیال ہے کہ شعر کہنے کے لیے استعداد کا ہونا ضروری ہے، ہر شعر تہہ در تہہ معانی سے لبریز ہو، شعر کی رنگینی سے لطف پیدا ہوتا ہے اور تکرار مضامین سے وہ لطف جاتا رہتا ہے۔

خامہ ہر چند رود لیک بہ معنی نہ رسد — سعی کارے نہ کند چوں نبود استعداد
در مکرر بستن مضمون رنگینی لطف نیست — کے دہد رنگ ارکسی بندد حنای بستہ را

تذکرہ نگاروں نے جس چیز کو معنی آفرینی، خیال بندی وغیرہ قرار دیا ہے، وہ تازہ مضامین کو کامیابی کے ساتھ اشعار میں استعمال کرنا ہوتا ہے، شاعر اپنے کلام کو رنگین بنانے کے لیے صنائع لفظی کے سہارے ڈھونڈتا ہے اور قدیم روش کے مطابق تجنیسات، محاورات اور رعایات لفظی سے کام لیتا ہے، غنی نے بھی اس اسلوب کے اشعار لانے میں بڑی مہارت اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے، تازہ سے تازہ مضمون لانے کے لیے انہوں نے مثالیہ کا اسلوب اختیار کیا ہے، وہ ایک مصرعہ میں ایک مقالہ یا حکمت آمیز و نصیحت آموز مضمون پیش کرتے ہیں، پھر دوسرے مصرعے میں اس کی تصدیق و تائید کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں، وہ حیات و کائنات اور فطرت کے مشاہدے سے ایسی ایسی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کو پڑھ کر تعجب اور انبساط کا احساس ہوتا ہے،

ہر دم تازہ سے تازہ مضمون لانے کا خیال پھر اسے نئے نئے انداز میں باندھنے کی فکر اور اس کے ساتھ ہی تہہ رکھنے کا انداز کبھی بھی بے راہ کر دیتا ہے اور اس طرح معانی میں ایہام پیدا ہوتا ہے۔

غنی کے نزدیک عشق کا رتبہ بلند اور عظیم ہے، چوں کہ عشق محض ہوس کاری نہیں، اس لیے محبوب بھی ہرجائی نہیں ہونا چاہیے، عشق زبردستی پیدا نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ تو ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کے ساتھ ہے، محبوب بھی نور عطا کرتا ہے، اسی کے نور سے ہم اس کے حسن کو دیکھتے ہیں جب حسن فروزاں ہو تو عشق بھی فروزاں ہوتا ہے، عشق میں فقیر و بادشاہ کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، اپنا یہ فلسفہ غنی مختلف اشعار کے ذریعے سمجھاتے ہیں۔

عشق بر یک فرش بنشاند گدا و شاہ را — سیل یکساں می کند پست و بلند راہ را
تا توانی عاشق معشوق ہرجائی مشو — می کند خورشید سرگرداں گل خورشید را
چشم عاشق روشن است از پرتو دیدار دوست — شمع نخل وادی ایمن جود پروانہ را

غنی کی دنیا خلوت گزینی، مادی اسباب سے بے تعلقی خاکساری اور قناعت و توکل کی دنیا ہے، ذلت پستی، گداگری دوں ہمتی کی دنیا نہیں، بلکہ سرفرازی، استغنا، بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کی دنیا ہے، غنی کے نزدیک صفائی قلب اور نور باطن سب سے بڑی نعمتیں ہیں، ان سے حقائق حیات و کائنات منکشف ہوتے ہیں اور دل تمام آفات سے محفوظ رہتا ہے، جب عرفان حاصل ہو جائے تو پھر ہر چیز کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے، وہ مشاہدات کو نہایت دل پذیر انداز میں پیش کرتا ہے، انہوں نے نہ صرف عالم گیر سچائیاں منکشف کی ہیں بلکہ رموز حیات کی طرف اشارے بھی کیے ہیں اور زندگی میں کام آنے والی نصیحتیں بھی کی ہیں، ہم سایوں اور ہم جنسوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے اصول بھی بتائے ہیں۔

غنی کا نام اس لیے بھی زندہ و پایندہ ہے کہ انہوں نے برصغیر ہند و پاک میں مثالیہ انداز شاعری کو کمال عروج تک پہنچا دیا ہے، ان کی شاعری کا طرفہ امتیاز بھی یہی ہے، یہ بڑا مشکل فن ہے ہر مقولے کے لیے بھی عین مناسب منطقی دلیل پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لیے غور و فکر اور دقت نظر کی ضرورت ہوتی ہے، غنی نے آئینہ، دریا، موج، حباب اور بالخصوص آسیہ یا آسیاب کے متعلق بہت سی مثالیں پیش کی ہیں، غنی نے فارسی زبان پر قدرت اور

مہارت دکھانے کے لیے محاورات کا بھی استعمال کیا ہے اور خاص طور پر رعایات لفظی کا ضرور خیال رکھا ہے۔

غنی کی شاعری کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ وہ دوسرے شعرا کی طرح صرف ایرانی شاعری کی روایات، تلمیحات، تشبیہات، استعارات استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ اپنے وطن کشمیر کی چیزوں کی خصوصیات کا بھی ذکر کرتا ہے، مثلاً سورج مکھی، پھول، نرگس، صندل، مہرہ مار وغیرہ۔

غنی کو اپنے آبائی مقبرہ راجوری کدل (سعید صاحب) میں دفن کیا گیا تھا اور وہاں ہی ان کے بھائی محمد زمان نافع دفن ہیں لیکن بدقسمتی سے مفتی محمد شاہ سعادت نے غلط فہمی کی بنا پر ان کے مقبرے کو عالی کدل بیان کیا ہے لیکن سارے ہم عصر تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ غنی کشمیری اپنے آبائی مقبرہ مذکورہ میں آرام فرما ہیں لیکن محکمۂ آثار قدیم اور اوقاف اسلامیہ کی تساہل اور غفلت شعاری کی وجہ سے یہ مقبرہ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

کتابیات

(۱) دیوان غنی کاشمیری، مطبوعہ نول کشور، ۱۹۳۱ء۔

(۲) دیوان غنی کشمیری، مطبوعہ تہران۔

(۳) دیوان غنی، مطبوعہ مصطفائی پریس بمبئی۔

(۴) تذکرہ شعرائے کشمیر از حسام الدین راشدی، جلد دوم۔

(۵) پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ۔

(۶) مختصر تاریخ ادب فارسی از محمد صدیق شبلی، لاہور۔

(۷) مولانا غنی کشمیری از محمد الدین فوق۔

(۸) تذکرہ شعرائے کشمیر از مرزا اصلح۔

(۹) تاریخ حسن جلد چہارم، مطبوعہ محکمہ تحقیق۔

(۱۰) تاریخ محمد اعظم دیدہ مری کشمیری۔

☆☆☆

اخبار علمیہ

ماہنامہ ''ینگ مسلم'' کی خبر ہے کہ ایک ۶۱ سالہ جرمن تاجر منفرڈ وین ایچ نے ٹوائلٹ پیپر پر لفظ ''قرآن'' چھپوایا اور اپنے اس پروڈکٹ کو اس نے مسجدوں کے استنجا خانوں میں بھیج دیا، اس کا یہ عمل شنیع قانونی لحاظ سے بھی جرم ہے اور یہ حقوق انسانی کی خلاف ورزی بھی ہے، گرفتاری کے بعد اس نے مغربی جرمنی کی عدالت میں کہا کہ اس نے یہ حرکت دولت وشہرت حاصل کرنے اور ان طلبہ کی مدد کے لیے کی ہے جو ''اسلامی انتہاپسندی'' کے خلاف برسرپیکار ہیں، واضح رہے کہ ڈینش نیوز پیپر میں رسول اللہ ﷺ کے توہین آمیز کارٹونوں کی اشاعت کے خلاف پوری دنیا بالخصوص عالم اسلام میں زبردست احتجاج ہوا، جس میں نازیبا واقعات بھی پیش آئے، اس لیے یورپ کے محکمہ عدالت نے پریس کی آزادی اور مذہبی پیرووں کے پرجوش احتجاج کے متعلق مذاکرات کرائے اور ان کے متعلق حدود کے تعین کے لیے مخصوص قانون وضع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

پاکستان کے ادارہ دارالسلام کی کتابیں یورپ کے موجودہ معیار طباعت کی حامل اور جدید اشاعتی ٹکنک اور لوازم سے بھی پوری طرح آراستہ ہوتی ہیں، علاوہ ازیں تحقیق واستناد کے لحاظ سے بھی ان کا پایہ بلند ہوتا ہے، اس لیے ان کی اشاعت بھی عالمی پیمانے پر ہورہی ہے بالخصوص دنیائے اسلام کے محققین اور اسکالرس ان سے استفادہ کرتے ہیں، البتہ اب یہ ادارہ طلبہ اور نوجوانوں کے لیے مفید مطلب کتابیں تیار کرنے کی جانب خاص توجہ دے رہا ہے، اس کا ہیڈ آفس ریاض میں ہے اور اس کی شاخیں دنیا کے اکثر شہروں میں پھیل گئی ہیں، اس کے جنرل منیجر نے ایک انٹرویو میں کہا کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات پر مشتمل مستند لٹریچر شائع کرنا ادارے کا اولین مقصد ہے جس کی تکمیل میں وہ ہمہ تن مصروف ہے۔

نئی دہلی میں نور ویلفیر ٹرسٹ مسلمانوں کو تعلیم وتعلم سے جوڑنے کا ایک نیا تجربہ کرنے جارہا ہے، اس کے لیے اس نے ایک ایسے اسلامی ٹیلی ویژن چینل کے قیام کا منصوبہ بنایا ہے جو الکٹرانک میڈیا کے وسیلے سے برصغیر ہند کے مسلمانوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے نیا طرز و تجربہ اپنائے گا اور انہیں اردو زبان میں قرآن وحدیث کی صحیح واقفیت بہم پہنچائے گا، اس چینل کا نام ''نور ٹی وی''

ہوگا، ٹرسٹ کے سربراہ نے کہا کہ عام طور پر مسلمانوں کا یہ معمول ہوگیا ہے کہ وہ جس فرقہ ومسلک سے وابستہ ہوتے ہیں اسی کے افکار کی اشاعت کرتے ہیں، ہماری کوشش یہ ہوگی کہ یہ نیا چینل کسی خاص مکتب فکر کی اشاعت کے بجائے نفس اسلام اور پوری قوم وملت کے احساسات کا ترجمان ہو، پوری دنیا کے وہ اہل علم ودانش اس چینل پر مدعو کیے جائیں گے جو اردو زبان پر پوری قدرت رکھتے ہوں گے اور اپنی مذہبی خدمات کے سبب پورے مسلم معاشرے میں متعارف ہوں گے، سعودیہ عربیہ کے مرکز الدعوہ سے وابستہ حضرات کو بھی بلایا جائے گا۔

استنبول کے رسالہ "نیوز لیٹر" کی اطلاع ہے کہ شام کی کلچرل وزارت اور IRCICA کے اشتراک سے ۲۷ تا ۳۰ ستمبر ۲۰۰۵ء کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی جس کا موضوع "عثمانی دور حکومت میں بلاد الشام" تھا، یہ کانفرنس جمہوریہ شام کے صدر ایچ۔ ای ڈاکٹر بشر اسد کی سرپرستی میں منعقد ہوئی، عرب ممالک، یورپ، ترکی، جاپان اور یو ایس اے کی یونی ورسٹیوں کے ۴۳ فضلا نے مقالات پیش کیے، جن میں دولت عثمانیہ کی تاریخ کے مطالعہ میں حائل مشکلات اور اس کے ماخذ، عثمانی سلطنت سے شام کے سیاسی وسماجی تعلقات، سولہویں تا اٹھارہویں صدی عیسوی میں شام کا اقتصادی ومالی نظام، حکومت عثمانیہ پر یورپ کے اثرات، عثمانی دور حکومت میں روشن خیالی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے موضوعات کے علاوہ تصوف اور خانقاہوں کے تہذیبی اور روحانی اثرات، زراعت، صنعت وحرفت، تجارت، نقل وحمل، تعلیمی ادارے، ثقافتی وسائنسی سرگرمیاں، طباعت اور پریس، کتب خانے وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، افتتاحی تقریب دمشق کے ہوٹل پیلس میں منعقد کی گئی جس میں وزیر تہذیب وثقافت ایچ۔ ای ڈاکٹر محمود السعید اور عرب جمہوریہ شام کے صدر کے علاوہ حکومت شام کے متعدد وزرا بھی ۔۔۔۔۔ رونق افروز ہوئے تھے۔

چین کے موسمیات کے ماہرین نے دعوا کیا ہے کہ ان کے ملک میں آنے والی آندھیوں کا تعلق سائبیریا کی ٹھنڈ سے ہے، جس کے ٹھنڈے علاقوں سے نکلی ہوا بڑے ریگستانی علاقے سے ہوکر گزرتی ہے اور اکثر وہ منگولیا کے بگولوں سے جاملتی ہے، جس سے چین میں گرد آلود آندھیاں آتی ہیں، مشرق میں سائبیریا کی ہوا وسطی اور مشرقی منگولیا سے ہوکر گزرتی ہے اور پورے چین، منگولیا کے درمیانی پوری علاقے، شانکشی اور ہیبئی علاقوں کو متاثر کرتی ہے، یہ اطلاع انر منگولیا آٹونومس ریجنل میٹراجیکل اسٹیشن سے وابستہ کانگ لنگ نے دی ہے۔

ک۔ ص۔ اصلاحی

وفیات

آہ! مولانا مجیب اللہ ندوی

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کے سابق رفیق، جامعۃ الرشاد کے بانی وناظم مولانا مجیب اللہ ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ان علما میں تھے جو اسلامی علوم سے واقف ہونے کے ساتھ ہی زمانے کے حالات، قوم وملت کے مسائل اور اپنے ملک اور دنیائے اسلام کے واقعات سے بھی باخبر رہتے تھے، ان کا انتقال ۱۲؍ مئی ۲۰۰۶ء کو مغرب کے وقت لکھنؤ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ہوا، دوسرے روز صبح کو ان کی لاش اعظم گڈھ لائی گئی اور اسی دن سہ پہر کو جامعۃ الرشاد کے جس کمرے میں وہ رہتے تھے اسی سے متصل پورب کی طرف کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی، مولانا بڑے چاق وچوبند اور چلت پھرت کے آدمی تھے، سفر کثرت سے کرتے تھے مگر گزشتہ دو تین برس سے طول عمر اور ضعف وعلالت کے باعث جامعۃ الرشاد کے باہر نکلنا بند کردیا تھا مگر اس معذوری اور خانہ نشینی کے باوجود ان کا ذہن ودماغ پوری طرح کام کرتا تھا اور لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی ایک حد تک جاری تھا، شروع سے وہ نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے، سفر حضر ہر جگہ جماعت سے نماز ادا کرتے تھے مگر آخر میں ضعف اتنا بڑھ گیا کہ مسجد کی حاضری موقوف ہوگئی جس کا انہیں بڑا ملال رہتا تھا۔

انتقال سے کئی ہفتے پہلے ان پر غشی طاری ہوئی اور بات چیت بند ہوگئی اور بالآخر وہ وقت بھی آپہنچا کہ ان کی جوش عمل سے سرشار، متحرک، جدوجہد سے معمور اور ہر دم رواں دواں رہنے والی زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور قوم وملت کا یہ ہمدرد اور بہی خواہ اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔

مولانا کا آبائی وطن غازی پور ضلع کا موضع کسی خورد تھا لیکن ان کی پیدائش اعظم گڈھ میں ہوئی جہاں ان کے والد محکمہ پولس میں ملازم تھے، مولانا کا بچپن یہیں کے قصبات میں گزرا اور بعد میں ان کی علمی وعملی، دینی وتعلیمی اور قومی وملی سرگرمیوں کا خاص مرکز بھی یہی ضلع بنا اور وہ اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

ناظرہ، حفظ قرآن اور اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں عربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جامعہ مظہر العلوم میں داخل کیا گیا جہاں کئی برس گزارنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا اور مولانا شبلی فقیہ جیراج پوری، مولانا شاہ حلیم عطا، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مفتی محمد سعید وغیرہ کے درس سے فیض یاب ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں فراغت حاصل کی۔

یہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا، مولانا کی بے چین و بے قرار طبیعت کا رجحان کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کی طرف تھا اور ان میں جوش وخروش سے حصہ لیا لیکن ان کا اصل مزاج دینی تھا، اس لیے جلد ہی سیاسی سرگرمیاں چھوڑ کر مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک میں شامل ہو گئے اور تعطیل کے ایام تبلیغی جماعتوں کے ساتھ گزارتے، پھر وہ جماعت اسلامی ہند میں شامل ہوئے اور ایک عرصے تک اس میں سرگرم رہے، وہ جس تحریک یا جماعت سے وابستہ ہوتے اس کے لیے رات دن ایک کر دیتے اور اس میں اس قدر سرگرمی سے حصہ لیتے کہ سب کو پیچھے چھوڑ دیتے، اس سے ان کی غیر معمولی قوت عمل اور جوش وولولہ کا اندازا ہوتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی ندوۃ العلما کے معتمد تعلیم تھے، سید صاحب وہاں جاتے تو کلاسوں میں جا کر طلبہ کو درس دیتے، اکثر منتہی اور فارغ طلبہ رمضان کی تعطیل میں اعظم گڈھ آجاتے اور سید صاحب انہیں اور رفقائے دارالمصنفین کو قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے، مولانا مجیب اللہ ہونہار بھی تھے اور حافظ قرآن بھی، سید صاحب کو ان کی صلاحیتوں کا اندازا ہو گیا تھا اس لیے جس سال یہ آخری درجے میں تھے، سید صاحب نے انہیں رمضان المبارک میں دارالمصنفین آنے کی دعوت دی اور کہا، آپ مجھے تراویح میں قرآن مجید سنایئے اور میں آپ کو قرآن مجید پڑھاؤں، ان کی یہی آمد دارالمصنفین میں قیام کی تقریب بن گئی اور پھر وہی ہر سال تراویح پڑھانے لگے، شہر میں رہنے لگے تو قریب کی مسجد میں وہی امامت کرتے اور تراویح پڑھاتے تھے، میرا جب دارالمصنفین سے تعلق ہوا تو مجھے بھی اپنی مسجد میں تراویح پڑھنے کے لیے اصرار سے بلاتے اور میں نے کئی سال ان کی اقتدا میں پڑھا بھی، وہ قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے، مجھے بڑا لطف ملتا تھا، جب تک ان میں قوت تھی وہ اپنی

مسجد میں خود ہی تراویح پڑھاتے تھے۔

سید صاحب ۱۹۴۶ء میں قاضی القضاۃ ہو کر بھوپال تشریف لے گئے، اس لیے مولانا مجیب اللہ صاحب کو دارالمصنفین میں ان کے ساتھ زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا تاہم اس قلیل عرصے میں بھی وہ ان کی صحبتوں اور علمی مجلسوں میں شریک رہتے تھے اور ان کے علمی کاموں میں مراجع کی تلاش میں مدد کرتے تھے، کبھی کبھی سفر میں بھی ان کی رفاقت کی، ایک دفعہ پشاور کے سفر میں سید صاحب ان کو اپنے ساتھ لوا گئے، مولانا محمد یوسف بنوری نے ان سے سوال کیا، بیضاوی کا متن کہاں ہے؟ یہ جواب نہ دے سکے تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ ان کے سینے میں ہے، ایک دفعہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی بہار جارہے تھے، انہوں نے سید صاحب کو اطلاع دی کہ میں فلاں ٹرین سے اعظم گڈھ آکر آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کسی کو اسٹیشن بھیج دیجیے گا، سید صاحب نے یہ خدمت ان کے سپرد کی، مولانا سیالکوٹی تہجد گزار تھے، سویرے تہجد کے لیے مسجد گئے، مولانا مجیب اللہ صاحب فرماتے تھے کہ اس وقت فجر کی اذان میں یا مولانا مسعود علی صاحب دیتے تھے، اس روز مولانا سیالکوٹی نے غلس میں اذان دی اور قدرے انتظار کر کے تنہا غلس میں نماز ادا کر لی، یہ جب مسجد آئے تو انہوں نے کہا یہاں اسفار میں نماز ہوتی ہے، کیا جماعت سے نماز پڑھنا افضل ہے یا اپنے مسلک کے مطابق غلس میں، مولانا نے فرمایا میں مسافر تھا، مجھے وقت معلوم نہیں تھا، جماعت سے نماز پڑھنا ہی افضل ہے مگر یہ دیر تک بحث کرتے رہے، ناشتے کے وقت مولانا نے سید صاحب سے فرمایا کہ فجر کے وقت ان صاحب زادے نے مجھے کافی تنگ کیا، مولانا مجیب اللہ صاحب عمر بھر سید صاحب کی عقیدت کا دم بھرتے رہے، ان سے والہانہ تعلق کی بنا پر ان پر سمینار بھی کرایا تھا۔

راقم مولانا مجیب اللہ صاحب کے نام اور ان کی کتاب "اہل کتاب صحابہ وتابعین" سے اس وقت واقف ہوا جب مدرسۃ الاصلاح میں زیر تعلیم تھا، اس وقت مولانا جماعت اسلامی کے سرگرم رکن تھے اور مدرسے میں بھی اس کا بڑا اثر تھا اور وہاں اس کے اکثر پروگرام بھی ہوتے تھے جن میں مولانا مجیب اللہ صاحب بھی تشریف لے جاتے تھے، یہاں ان کو دیکھنے کے باوجود ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا مگر جب ۱۹۵۷ء میں میرا بھی دارالمصنفین سے تعلق ہوا تو ان

سے میری قربت بہت بڑھ گئی، وہ مجھے اکثر اپنے گھر بلاتے اور بڑی شفقت اور دل جوئی کرتے، میں ان سے ہر ہر معاملے میں مشورہ کرتا، میرے والد اور بھائیوں سے بھی ان کا بڑا تعلق ہو گیا تھا اور وہ ہم لوگوں کی دعوت پر دو ایک بار میرے گھر بھی تشریف لے گئے۔

اتفاقاً اسی زمانے میں مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ داروں نے جماعت کے بعض ارکان کا تعلق مدرسہ سے ختم کردیا، اس سے قدرتاً جماعت کے لوگ بہت برہم ہوئے، مولانا مجیب اللہ صاحب بھی بڑے طیش میں تھے اور وہ مجھے دیکھتے ہی اپنا غصہ ظاہر کرنے لگتے، حالاں کہ میرا کوئی ذمہ دارانہ تعلق اس وقت مدرسے سے نہ تھا، اسی موڑ پر انہیں جامعۃ الرشاد کے قیام کا خیال آیا اور بے سروسامانی کے باوجود ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الرشاد قائم کردیا۔

شروع میں یہ مدرسہ شہر کی دفتری مسجد میں تھا جس کے مولانا امام تھے اور اسی کے قریب ان کی رہائش گاہ تھی، مدرسین اور طلبہ کی رہائش کے لیے بھی قریب ہی کرایے کا ایک مکان لے لیا جو چند کمروں، ایک برآمدے اور ایک صحن پر مشتمل تھا، شروع ہی میں ان کو اچھا اسٹاف اور کارکن اور طلبہ بھی مل گئے جن میں اکثر مدرسۃ الاصلاح سے علاحدہ کیے گئے یا خود سے علاحدہ ہوجانے والوں پر مشتمل تھا، البتہ مالیات کی فراہمی میں کچھ زحمتیں اٹھانی پڑیں تاہم جماعت اسلامی کی تنظیم سے ان کو اس میں بھی بڑی مدد ملی، اس وقت مولانا جماعت سے وابستہ تھے مگر جب انہوں نے جامعہ کو جماعت کے حوالے نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو جماعت کی تائید و ہمدردی ختم ہوگئی لیکن وہ ساری مشکلات پر قابو پاتے رہے اور مدرسہ بھی ترقی کے مراحل طے کرتا رہا، اسی زمانے میں وہ جماعت اسلامی سے علاحدہ ہوگئے اور مولانا شاہ وصی اللہ سے بیعت ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد احمد پرتاپ گڈھی کی طرف رجوع ہوئے۔

جب ان کی ساری قوت مدرسے پر صرف ہونے لگی تو دارالمصنفین کے اس وقت کے ذمہ داروں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ یا تو وہ یک سوئی سے مدرسے ہی کے لیے اپنے کو فارغ کرلیں یا اس کی نگرانی کسی اور کو سپرد کرکے عام نگرانی کی حد تک اس سے وابستہ رہیں مگر انہوں نے غور و فکر اور رائے مشورے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ وہ صرف مدرسہ کی خدمت میں مصروف رہیں گے کیوں کہ اس کا کام اتنا پھیل گیا تھا کہ اسے چھوڑ دینا مشکل تھا، اب اللہ پر بھروسہ

کرکے اور اپنے بعض رفقا اور خاص معاونین کو لے کر انہوں نے جامعۃ الرشاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اس کے لیے بیرون ملک گئے، ایک وسیع زمین حاصل کی جس پر عالی شان اور مستحکم عمارتیں اور خوب صورت مسجد تعمیر کرائی اور بڑے صبر و استقلال سے جامعۃ الرشاد کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا، اس سے ان کی مضبوط قوت ارادی اور آہنی عزم و ارادے کا پتا چلتا ہے، وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ جامعۃ الرشاد کی حالت اطمینان بخش نہ ہوگئی، اس زمانے میں انہوں نے اپنی ساری دل چسپیاں اور ہر طرح کے مشاغل کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب میں گوناگوں علمی و عملی صلاحیتیں تھیں اور وہ بڑے متحرک اور فعال تھے، تصنیف و تالیف سے انہیں بڑی مناسبت تھی، دارالمصنفین سے ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں ''اہل کتاب صحابہ و تابعین'' اور ''تبع تابعین'' اول الذکر کا مقدمہ بڑی دیدہ ریزی سے لکھا، دوسری کتاب میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے حالات بھی بڑے تلاش و تفحص سے لکھے لیکن اس سے اہم چیز ان کے فقہی و اجتہادی کارناموں پر بحث و گفتگو ہے، اس کے علاوہ معارف کے لیے انہوں نے درجنوں عالمانہ و محققانہ مضامین لکھے، ان کی فقہ پر بڑی گہری نظر تھی، ان کے اکثر فقہی مضامین کو اہل علم نے بہت پسند کیا اور ان کے ملک کی بعض زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، ادب سے بھی شغف تھا مگر اس کی طرف کم توجہ کی۔

انہیں درس و تعلیم اور طلبہ کی ذہنی و دماغی اصلاح و تربیت سے بڑی دل چسپی تھی، جامعۃ الرشاد اسی ذوق کا مظہر ہے، جب اتر پردیش میں دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی اور مکاتب کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے اعظم گڈھ اور اس کے ملحق اضلاع کا طوفانی دورہ کیا اور گاؤں گاؤں میں مکاتب کا جال بچھا دیا۔

ان میں اچھی انتظامی صلاحیت تھی، جامعۃ الرشاد کو بڑے حسن و خوبی سے چلایا اور اس کے زیر اہتمام کئی کامیاب علمی و دینی پروگرام کیے۔

قومی و ملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اعظم گڈھ میں مسلمانوں کے کسی علمی، تعلیمی، دینی اور ملی کام میں اس وقت تک جان نہ پڑتی جب تک وہ اس میں شامل نہ ہوتے، ہندوستان کے مسلمانوں پر آئے دن جو افتاد آتی رہتی ہے اس سے بہت کبیدہ رہتے تھے، ان کی مظلومی اور بے بسی

دیکھ کر تڑپتے تھے، معاندین اسلام اور فرقہ پرستوں کے خلاف برابر علمی و عملی اور قلمی جہاد میں مصروف رہتے، اجودھیا کی بابری مسجد ہو یا مسلم کش فسادات اور پولس کی بربریت، ہر معاملے میں بے خطر کود پڑتے اور جان کی بازی لگا دیتے، بڑی سی بڑی قربانی دیتے اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے۔

ان کی دینی، علمی اور فقہی عظمت کا اعتراف پورے ملک میں کیا گیا، کبار علما اور اہل مدارس سے ان کے روابط تھے، ہر جگہ کی تقریبات اور پروگرام میں مدعو کیے جاتے تھے، ان کی اصلاحی، معاشرتی اور ملی خدمات کو مسلمانوں کی آل انڈیا تنظیمیں قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور ان کے مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتی تھیں، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل اور فقہ اکیڈمی کے موقر رکن تھے۔

جامعۃ الرشاد کے استحکام کے بعد وہ بڑی یک سوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور اس کے لیے ندوۃ التالیف والترجمہ کا شعبہ قائم کیا اور وہاں سے اپنے پرانے مضامین کتابی صورت میں شائع کرنے کے علاوہ بعض ہلکے پھلکے رسالے اور کتب بھی شائع کیں اور ماہنامہ "الرشاد" نکالا، اس کے اداریے عموماً بہت پسند کیے جاتے تھے جن میں ملک و ملت کے موجودہ مسائل پر بحث و تجزیہ کیا جاتا تھا، "سیرۃ النبی ﷺ" کا ساتواں حصہ جو معاملات پر مشتمل تھا، نامکمل رہ گیا تھا، وہ کہتے تھے میں اسے مکمل کروں گا اور غالباً اس سلسلے کے بعض مضامین لکھے بھی، اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بڑی صلاحیتیں تھیں اور ان کی اٹھان بھی بہت شاندار تھی مگر دارالمصنفین سے وابستگی کے زمانے میں ان کے قلم سے جس معیار کی تحریریں شائع ہوئیں وہ معیار بعد کی تحریروں کا نہیں رہا، ان کی اصل جگہ دارالمصنفین تھی لیکن مزاج میں وارستگی اور طبیعت میں اتار چڑھاؤ تھا، کسی نظام کی پابندی اور دوسرے کی ماتحتی اور مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا کے تعلقات ہر طبقے کے لوگوں سے تھے اور سب سے اچھا برتاؤ کرتے تھے لیکن اگر کسی کی بات یا کوئی ادا پسند نہیں آتی تو موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے جس کے انداز میں بڑی شدت ہوتی تھی مگر بہت جلد سنبھل جاتے، کسی کے خلاف اپنے دل میں کینہ و کدورت نہ رکھتے، ان کی وفات بڑا حادثہ اور مسلمانوں کا شدید خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

اقبال، جدید تنقیدی تناظرات: مرتبہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۶۱۲، قیمت: ۴۰۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس مسلم یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

علامہ اقبال کی متاع شاعری بلکہ متاع فکر و نظر پر بے شمار کتابوں میں شاید کم ایسی ہیں جن میں مطالعہ کی وسعت، فکر کی گہرائی اور تجزیے کی اصابت، شاعر کی تہہ در تہہ شعری فطانت سے آشنا نظر آتی ہو، اس کتاب کے فاضل اور جید مرتب ایک دیدہ ور نقاد خصوصاً غالب و اقبال کے حوالے سے درجہ امتیاز پر فائز ہیں، اس سے پہلے بھی اقبال پر ان کی ایک تالیف اور چند تصانیف اقبالیات کے ذخیرے کو پر ثروت بنا چکی ہیں، زیر نظر کتاب اصلاً تیس مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مرتب کے تین مضامین اس ترتیب سے ہیں کہ آغاز و اختتام اور وسط ان ہی کے نام ہے، سید عاصم علی، زیڈ اے عثمانی، وزیر آغا، قاضی افضال حسین اور ابوالکلام قاسمی کے دو دو مضامین کے علاوہ رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، یوسف امین، اقبال احمد انصاری، سید امین اشرف، شمیم حنفی وغیرہ کا ایک ایک مضمون بھی شامل ہے، اقبال کے متعلق جدید تنقیدی تناظرات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اقبالیات کے جدید نقادوں کو اس صف میں جگہ ملے، فاضل مرتب کے اقبالی ذہن اور معیار ترجیح کا اثر بھی اس انتخاب میں ناگزیر تھا، ترقی پسند گو اب جدید نہیں رہے تاہم ان کو زیادہ قدیم بھی نہیں کہا جا سکتا اور مرتب جلیل کا رویہ ان کے لیے ڈھکا چھپا نہیں، افتتاحیہ جو بجائے خود ایک مکمل مربوط و مفصل تجزیے سے کسی طرح کم نہیں، اس میں انہوں نے اختر رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، پروفیسر احتشام حسین، سجاد ظہیر سے سردار جعفری تک اور دوسری جانب ڈاکٹر یوسف حسین سے کلیم الدین احمد اور شکیل الرحمٰن تک اقبال کی مدح و قدح میں تناظرات سے زیادہ نظریات پر اپنے خاص انداز میں اشارے کیے اور یہ اشارے کہیں کہیں قارئین کے لیے استشارے بلکہ استخارے میں بدل گئے، صاحبان اقبال کامل اور نقوش اقبال اس پوری فہرست میں شاید اس لیے نہیں کہ وہ قدامت کی مدت کی تحدید میں ہیں، خواجہ منظور حسین کی کتاب کو امتیازی حیثیت کی حامل بتایا گیا ہے، خود خواجہ صاحب کا ایک مضمون اقبال کے چند شعری نشان اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے، فاضل مرتب کی پسند اور ناپسند سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ فلسفہ، تصوف اور شاعری کے اقبال کے اصل محور تک جس راست

رسائی پر ان کو دست رس حاصل ہوئی، چند کے سوا اور کم بلکہ بہت کم ہیں، خصوصاً تصوف کے باب میں اقبال کے نظریے کی تفہیم میں وہ اعتدال قابل ذکر ہے جو جدید تنقید کو خوش گوار بناتا ہے، مثلاً یہ کہنا کہ تصوف کی دوشتوں کے باب میں اقبال کا ذہن غیر مبہم ہے، ایک تو یہ کہ اس کی بنیاد ایک گہرے اور غیر منفصل انفرادی تجزیے کے کھرے پن پر ضرور ہے لیکن اسے کسی معاشرے کی تنظیم کے لیے اساس کار نہیں بنایا جاسکتا، فاضل مرتب کا یہ احساس بھی پختگی کا حامل ہے کہ "تصوف کے سیاق و سباق میں اتنی فلسفیانہ موشگافیاں کی گئی ہیں اور نو افلاطونی، ایرانی اور ویدانتی عناصر کی وجہ سے یہ کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، تاہم حجازی الاصل تصوف کو اسلام سے جدا ہو کر دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"، تصوف کے علاوہ فلسفیانہ شاعری اور خودی، عشق، فقر، خرد، وجدان وغیرہ مقامات اقبال سے افتتاحیہ میں تعرض ہے، ناقدین اقبال کے بعض خیالات کی تردید میں افتتاحیہ کے یہ مختصر اشارے دراصل ایک ایسے متن کی حیثیت رکھتے ہیں کہ باقی مضامین کو ان کی شرح و تفسیر کہا جاسکتا ہے اور اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی کی بازخوانی بڑی بامعنی ہے اور ان کا یہ جملہ اقبال کے کلام کے پس منظر میں نمایاں طور پر پیش نظر رہنے کے لائق ہے کہ انہوں نے جذبات کو فکر کا درجہ دیا اور فکر کو جذبات کا آب و رنگ بخشا، وہ کہیں حکیم اور کہیں شاعر ہیں اور بالآخر دونوں ایک دوسرے میں ممزوج یا مربوط نظر آتے ہیں، ایک اور مضمون میں تناظر کے ضمن میں بڑی خوبی سے بحث کے بعد یہ ثابت کیا گیا کہ "حقیقت صرف یہی ہے کہ اقبال توحید کے مرکز کے اطراف گردش پذیر نظام اقدار سے اپنی شاعری کا ڈھانچہ ترتیب دیتے ہیں"، کتاب میں علامہ اقبال کے دو انگریزی مضامین کے ترجمے بھی ہیں، ایک عبدالکریم الجیلی کے تصور مطلق کے بارے میں ہے اور اس کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تیس بتیس سال کی عمر میں الجیلی کی الانسان الکامل پر ایک تبصرے کی شکل میں لکھا گیا تھا، دوسرا مضمون "بیدل، برگساں کی روشنی میں" کے عنوان سے ہے، علامہ کی یہ دونوں تحریریں نایاب تھیں، باقی مضامین فاسٹر، نکلسن اور ہربرٹ ریڈ کے ہیں اور ان کا سب ترجمہ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کے قلم سے ہے، ان مضامین سے گو کتاب کے عنوان سے ظاہراً ربط نہیں تاہم ان سے اس کی افادیت اور وقعت میں بڑا اضافہ ہوا ہے، البتہ اس بلند پایہ مجموعہ کی کتابت میں غلطیاں خاصی ہیں، آیت تک میں غلطی ہے، حجازی الاصل کا مجازی الاصل ہونا اچھا نہیں لگتا۔

سید حامد: از پروفیسر نجمہ محمود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات

۴۶۵، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کراچی، سید اینڈ سید پبلشرز، کراچی۔

جناب سید حامد موجودہ دور قحط الرجال میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ذات سزاوار حمد کا خصوصی عطیہ ہیں، ان کی غیر معمولی شخصیت کو بجا طور پر ہشت پہل کہا جاسکتا ہے، صاحب تدبیر منتظم، ماہر تعلیم، مصلح، شاعر، انشاپرداز، خوش اثر مقرر اور حلقہ بزم و رزم کے فرق کے ساتھ ریشم و فولاد کی خصوصیت کو سموئے ہوئے انسان کی جملہ صفات کے وہ حامل ہیں لیکن ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ان کی جہد مسلسل اور ان کا سوز دروں ان کی حیات کا سب سے روشن باب ہے، ان کو شاید اسی لیے سرسید ثانی کہنے میں ان کے معتقدین کو تامل نہیں، ان کی شخصیت پر مضامین و تاثرات آئے ہیں لیکن ایک وسیع کینوس پر ان کے مکمل اور خوبصورت مرقع کی ضرورت تھی، زیر نظر کتاب اسی ضرورت کا ایک دلکش اظہار ہے، حامد و محمود کے عناصر اشتقاق کی معنویت اگر سامنے رہے تو حمد و مدح کی توضیح مشکل نہیں نظر آتی، لیکن مصنفہ کو اس حقیقت کا ادراک بھی ہے کہ تصنیف میں بلند پایہ، کریم النفس تحقیقات کی ضرورت ہوتی ہے جو انکشافی بھی ہو اور تشریحی بھی اور جو اپنے اندر معنویت کی خوبی بھی رکھتی ہو، اس میدان میں غلو، مستور نہیں رہتا لیکن جہاں غلو کی تہہ میں خلوص ہو اور مزید غلو کو مزید حق گوئی سمجھنے اور برتنے کی جرأت ہو وہاں یہ نقص، عیب نہیں رہ جاتا اور جب لکھنے کی تحریک میں معجزاتی طور پر انسان کامل ﷺ کی شخصیت کے مبارک مطالعہ سے ہو تو اس میں تقدس قطعی حیرت انگیز نہیں رہ جاتا، مصنفہ نے دانستہ کوشش کی ہے کہ حیات حامد کی ترجمانی زیادہ تر خود جناب حامد کی زبانی ہو، بچپن، تعلیم، ماحول اور اکتسابات کی تفصیل شاید اسی لیے زیادہ معتبر ہوگئی ہے، عناوین کے انتخاب میں کلام اقبال سے استمداد، اقبال کے مرد مومن کی یاد ہی تازہ نہیں کرتا، لکھنے والے کے ذوق کے حسن و سلاست کی شہادت بھی دیتا ہے، آخری حصہ میں چند متفرق تحریروں کو بھی یکجا کردیا گیا جس سے اس مرقع کے رنگ و روغن مزید آبدار ہوگئے ہیں، شروع میں محترمہ سعدیہ راشد صدر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ڈاکٹر ثناء اللہ ندوی کی مختصر مگر پر اثر تحریریں بھی ہیں، یہ امید درست ہے کہ ایوان ہائے اردو میں اس کاوش کو شرف پذیرائی سے نوازا جائے گا۔

ع-ص

دارالمصنفین کا سلسلہ تاریخ ہند

نمبر	کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔	مقدمہ رقعات عالم گیر	سید نجیب اشرف ندوی	492	80/-
۲۔	بزم تیموریہ اول	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	605	150/-
۳۔	بزم تیموریہ دوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	266	50/-
۴۔	بزم تیموریہ سوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	276	56/-
۵۔	بزم صوفیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	746	140/-
۶۔	ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	524	80/-
۷۔	مختصر تاریخ ہند	سید ابوظفر ندوی	194	50/-
۸۔	ہندوستان کی کہانی	عبدالسلام قدوائی ندوی	70	20/-
۹۔	تاریخ سندھ	سید ابوظفر ندوی	420	56/-
۱۰۔	ہندوستان عربوں کی نظر میں اول	ضیاء الدین اصلاحی	410	75/-
۱۱۔	ہندوستان عربوں کی نظر میں دوم (جدید ایڈیشن)	ضیاء الدین اصلاحی	358	125/-
۱۲۔	گجرات کی تمدنی تاریخ	ابوظفر ندوی		
۱۳۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	648	80/-
۱۴۔	بزم مملوکیہ	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	370	70/-
۱۵۔	ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے	ادارہ	354	50/-
۱۶۔	ہندوستان کے سلاطین علماء و مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر	مرتبہ: سید صباح الدین عبدالرحمٰن	238	75/-
۱۷۔	کشمیر سلاطین کے عہد میں	ترجمہ: علی حماد عباسی	468	56/-
۱۸۔	ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	134	30/-
۱۹۔	ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں اول	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	252	50/-
۲۰۔	ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں دوم	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	180	30/-
۲۱۔	ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں	ابوالحسنات ندوی	132	25/-
۲۲۔	عرب و ہند کے تعلقات	سید سلیمان ندوی	442	95/-

लाना आजाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
(A Central University Established by an Act of the Parliament in 1998)
Gachibowli, Hyderabad - 500 032
Phone(040) 2300 6612-15/Fax 2300 6603/ Website www.manuu.ac.in

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ 2006-07 برائے بیچلرس پری پیرٹری پروگرام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نظامت فاصلاتی تعلیم کے تحت بیچلرس پری پیرٹری پروگرام میں سال 2006-07ء کے لیے داخلے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ بیچلرس پری پیرٹری پروگرام چھ ماہی پروگرام ہے۔ یہ پروگرام ان طلبا کے لیے ہے جو انڈر گریجویٹ پروگرام میں داخلے کے لیے انٹرمیڈیٹ (10+2) یا اس کے مماثل قابلیت نہیں رکھتے ایسے تمام طلبا اس پروگرام کے ذریعے انڈر گریجویٹ کورس میں داخلہ حاصل کرسکتے ہیں۔

نوٹ: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے ایسے تمام طلبا کے لیے جو (10+2) یا اس کے مماثل قابلیت نہیں رکھتے ڈگری کورس میں داخلے کے لیے اہلیتی امتحان منعقد ہوتا تھا، لیکن اس تعلیمی سال 2006-07 سے یونیورسٹی کی جانب سے اہلیتی امتحان کے بجائے بیچلرس پری پیرٹری پروگرام شروع کیا جارہا ہے، جس میں کامیاب ہونے والے طلبا مختلف ڈگری کورس میں داخلہ حاصل کرسکتے ہیں۔

پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر 650 روپے کے ڈرافٹ اور بذریعہ ڈاک کے 700 روپے کا ڈرافٹ جو کسی بھی قومیائے ہوئے بینک سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نام بنایا گیا ہو اور حیدرآباد میں قابل ادا ہو روانہ کرکے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ درخواست فارم یونیورسٹی کے ویب سائٹ سے بھی ڈاؤن لوڈ کیے جاسکتے ہیں، لیکن ایسی درخواستوں کے ساتھ 650 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ منسلک کرنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اسٹڈی سنٹرس، ریجنل سنٹرس یونیورسٹی ہیڈکوارٹر سے بذریعے ڈیمانڈ ڈرافٹ بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں، دیگر تفصیلات یونیورسٹی ویب سائٹ www.manuu.ac.in سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

پراسپکٹس مع درخواست فارم یونیورسٹی کے ویب سائٹ پر 22 مئی 2006ء دستیاب رہیں گے۔ اس کے علاوہ تمام ریجنل سنٹرس، اسٹڈی سنٹرس اور یونیورسٹی ہیڈکوارٹر 29 مئی 2006ء سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ تکمیل شدہ درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ 30 جون 2006ء ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے مختلف ڈگری، پی جی اور ڈپلوما پروگرام (فاصلاتی) میں داخلے کے لیے ماہ جولائی میں علاحدہ اعلان جاری کیا جائے گا۔

ڈائرکٹر

رجسٹرار